قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

طلوعِ اسلام

جنوری 1980

اس پرچہ میں :

مومن کی زندگی—قرآن کے آئینے میں

(پرویز)

شائع کردہ: ادارۂ طلوعِ اسلام-۲۵-بی گلبرگ-۲ لاہور

قیمت فی پرچہ 3 روپے

قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

ماہنامہ طلوعِ اسلام لاہور

ٹیلی فون نمبر
۸۰۸۰۰

خط و کتابت
ناظم ادارہ طلوعِ اسلام - ۲۵/بی گلبرگ ۲ - لاہور

قیمت فی پرچہ
۳
تین روپے

بدلِ اشتراک
سالانہ
پاکستان -/۳۶ روپے
غیر ممالک ۳ پونڈ

جلد ۳۳ | جنوری ۱۹۸۰ء | شمارہ ۱

فہرست

۱- لمعات ...... (قائدِ اعظمؒ، اور اقبالؒ کے تعلقات) ۲
۲- مومن کی زندگی .... (قرآن کے آئینے میں) ...... (محترم پرویز صاحب) ۹
۳- "مطالب الفرقان" (جلد سوم) ۳۷
۴- "قرآنی فیصلے" (جلد چہارم) ۳۸
۵- "طاہرہ کے نام خطوط" - "اسلامی معاشرت" .... (نئے ایڈیشن) ۳۹
۶- علامہ اقبالؒ کا پیغامِ نوروز ۴۰
۷- علتِ مرض اور اس کا علاج ۴۲
۸- مدرسۂ علی گڑھ سے دانش گاہِ قرآن تک ...... (محترم صفدر سلیمی مرحوم) ۴۹
۹- فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی ۶۳
۱۰- قرآنی درس کے اعلانات وغیرہ ۶۴

ایڈیٹر - محمد خلیل - ناشر - سراج الحق - مقامِ اشاعت - ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور - پرنٹر - شیخ نیاز احمد - مطبوعہ علمی پرنٹنگ پریس ۷، ہسپتال روڈ - لاہور

باسمہ تعالیٰ

لمعات

قائدِ اعظمؒ ـــــ اور اقبالؒ کے تعلقات

(۲۵ دسمبر کی یاد میں)

یہ حقیقت ہے، جس سے کسی کو بھی انکار نہیں ہو سکتا کہ مسلمانانِ ہند کی تقدیر بدلنے کا بنیادی سبب جناحؒ اور اقبالؒ کا قِران السعدین ہے۔ جناحؒ اور اقبالؒ کی ابتدائی زندگی (بلکہ یوں سمجھئے کہ بیسویں صدی کے چوتھے عشرہ سے پہلے کی زندگی) ایک دوسرے کی ضد تھی۔ ان متضاد عناصر میں، اس قدر اتفاق ہی نہیں، ائتلاف کس طرح پیدا ہو گیا، یہ وہ مقام ہے جہاں چشمِ منطق کے سامنے حیرت کے سوا کچھ نہیں آتا۔ مسٹر جناحؒ، یوں کہئے کہ "پیدائشی نیشنلسٹ" تھے۔ انہوں نے ۱۹۲۵ء میں لجسلیٹو اسمبلی میں ایک تقریر کے دوران کہا تھا کہ "میں اوّل بھی نیشنلسٹ ہوں.... دوم بھی نیشنلسٹ اور آخر بھی نیشنلسٹ"۔ اور علامہ اقبالؒ کے نزدیک وطنیت (یا نیشنلزم) کفر اور شرک تھی۔ وہ اسے 'عصرِ حاضر کے تازہ خداؤں میں سب سے بڑا بُت' قرار دیتے تھے۔ لہٰذا، ان دونوں میں ملاپ کی کیا صورت ہو سکتی تھی؟ عملی سیاست میں اختلاف کا یہ عالم کہ علامہ اقبالؒ دوسری گول میز کانفرنس (۱۹۳۱ء) میں، مسلم ڈیلیگیشن کے ممبر کی حیثیت سے لندن تشریف لے گئے تو فیڈرل کمیٹی کے ایک فیصلہ کے خلاف، جو مسٹر جناحؒ اور سر محمد شفیع کی تائید سے عمل میں آیا تھا، احتجاج کے طور پر آپ نے وفد سے علیحدگی اختیار کر لی اور واپس وطن تشریف لے آئے۔ لیکن مشیت کو کچھ اور ہی منظور تھا۔

مسٹر جناحؒ، ہندو مسلم اتحاد کے لئے مسلسل جہاد کرتے رہے۔ اس باب میں ان کی سرگرمیوں کا یہ عالم تھا کہ میثاقِ لکھنؤ پر، مسز سروجنی نیڈو نے انہیں "ہندو مسلم اتحاد کے پیامبر" کے خطاب سے نوازا۔ لیکن ایک عمر کی تگ و دو کے بعد ان پر یہ حقیقت واشگاف ہوئی کہ ہندو مسلم اتحاد ناممکن ہے اور ان کی ساری کوششیں بیکار ہیں۔ وہ اس تلخ تجربہ سے اس قدر دل برداشتہ ہوئے کہ سیاست ہی نہیں، وطن تک چھوڑ کر لندن میں رہائش اختیار کر لی۔

لیکن دیدہ ور اقبالؒ کی نگۂ بصیرت کی داد دیجئے کہ اس قدر بُعد اور افتراق کے باوجود، وہ اس نتیجہ پر پہنچے کہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اگر کوئی شخص صحیح راہ نمائی کر سکتا ہے تو وہ صرف جناحؒ ہے۔ اپنے اس فیصلہ کے بعد انہوں نے مسٹر جناحؒ کو (CONVERT) کرنے کی کوشش شروع کر دی۔ جو لوگ مسٹر جناحؒ کے مزاج اور افتادِ طبیعت سے واقف ہیں وہ جانتے ہیں کہ انہیں (CONVERT) کرنا ـــــ اور وہ بھی ایسے مسئلہ میں جس کے خمیر سے ان کے آب و گل کی تعمیر ہوئی تھی، کس قدر امرِ محال تھا۔ علامہ اقبالؒ ان حقائق سے بخوبی واقف تھے۔ لیکن اس کے باوجود انہیں اپنے مؤقف کی صداقت اور اپنے دلائل کی محکمیت پر اس قدر پختہ یقین تھا کہ وہ اس مقصد کے حصول کے لئے مسلسل جد و جہد کرتے رہے تاآنکہ مسٹر جناحؒ ان سے متفق ہو گئے۔ یہ حقیقت شاید ایک راز ہی رہتی

اگر ہیکٹر بولیتھو (HECTOR BOLITHO) اپنی کتاب (JINNAH) میں اس کی نقاب کشائی نہ کرتا۔ وہ اس میں لکھتا ہے :-

مسٹر جناح نے لندن میں سر محمد اقبال سے بہت سی ملاقاتیں کیں' وہ بڑے اچھے دوست تھے۔ مسٹر جناح اگرچہ (اپنے سابقہ سیاسی مسلک کے متعلق) اب کسی غلط فہمی میں نہیں تھے، بایں ہمہ وہ اقبال کے دلائل سے (اتنی جلدی) متفق نہیں ہوئے۔ اس میں قریب دس سال کا عرصہ لگ گیا کہ مسٹر جناح نے اس کا اعتراف کیا کہ ہندوستان کی سیاست کے گہرے مطالعہ کے بعد وہ اس نتیجہ پر پہنچ گئے ہیں کہ اقبال کا نقطۂ نظر صحیح ہے۔ (صفحہ ۹)

اس تبدیلیٔ فکر و نظر کے بعد جب مسٹر جناح واپس وطن آئے تو ہیکٹر بولیتھو نے ان کی اس وقت کی کیفیت کا نقشہ ان الفاظ میں کھینچا ہے :-

مسٹر جناح اپنے بمبئی کے مکان میں بالکل تنہا تھے۔ ان کے پاس کوئی ذاتی سٹاف نہیں تھا حتیٰ کہ کوئی سیکرٹری بھی نہیں جو ان کے خطوط کی نقلیں رکھ سکتا اور ان کے کاغذات کو باقاعدہ فائل کئے جاتا۔ اس بے قاعدگی کے باوجود ان کے دراز میں خطوط کا ایک ایسا بنڈل تھا جن سے وہ تسکینِ خاطر حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ وہ خطوط تھے جو علامہ اقبال نے انہیں انگلستان میں ۱۹۳۲ء میں کی گئی ملاقات کے بعد لکھے تھے۔ اقبال نے ۲۸ مئی ۱۹۳۷ء کے ایک خط میں لکھا تھا کہ

"ہندی مسلمانوں کے مسائل کا واحد حل یہی ہے کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے، انہیں باقی ماندہ ملک سے الگ کر کے ان میں آزاد مملکت یا مملکتیں قائم کر دی جائیں۔ کیا آپ کا خیال نہیں کہ اس کے لئے مناسب وقت آ پہنچا ہے؟ (صفحہ ۱۱۱)

آپ سوچئے کہ علامہ اقبال کے خطوط کا وہ بنڈل جس کی طرف بولیتھو نے اشارہ کیا ہے، ملت کے لئے کس قدر متاعِ گراں بہا تھا۔ لیکن وائے برحالِ ما کہ ان خطوط کا کوئی نام و نشان نہیں ملتا۔ نہ ہی ان خطوط کا جو قائد اعظم نے جواب میں لکھے تھے۔ "اقبال کے خطوط جناح کے نام" کا جو مجموعہ شائع ہوا ہے اس میں مئی ۱۹۳۶ء تا نومبر ۱۹۳۷ء کے چند خطوط ہیں۔ مسٹر بولیتھو جن خطوط کا ذکر کرتا ہے وہ ۱۹۳۲ء اور ۱۹۳۶ء کے درمیانی عرصہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ علامہ اقبال نے ۲۱ جون ۱۹۳۷ء کو قائد اعظم کے نام جو خط لکھا، اس نے ہماری تاریخ کے دھارے کا رُخ بدل دیا۔ انہوں نے اس خط میں لکھا تھا

میں جانتا ہوں کہ آپ بہت مصروف ہیں لیکن مجھے معلوم ہے کہ میرا آپ کو بار بار لکھنا گراں نہیں گزرتا ہوگا۔ (میرے اس تکرار اور اصرار کی وجہ یہ ہے کہ) میری نگاہوں میں اس وقت ہندوستان بھر میں آپ ہی وہ واحد مسلمان ہیں جن سے ملت کو اپنی یہ امیدیں وابستہ کرنے کا حق ہے کہ آپ اس طوفان میں جو یہاں آنے والا ہے' اس کی کشتی کو صحیح و سالم، بامن و عافیت ساحلِ مراد تک لے جائیں گے۔

ان کوائف سے آپ سوچئے کہ ملتِ اسلامیہ کے آسمان پر ان دو درخشندہ ستاروں کا "قرانِ السعدین" کیسے ہوا تھا اور اس نے کس طرح اس ملت کی تقدیر بدل دی؟

آل انڈیا مسلم لیگ نے ۱۹۳۶ء کے انتخابات میں حصہ لینے کے لئے ایک سنٹرل پارلیمنٹری بورڈ اور مختلف صوبوں میں پراونشل پارلیمنٹری بورڈ بنائے۔ پنجاب میں ایک بورڈ علامہ اقبال کی صدارت میں متشکل ہوا۔ اس بورڈ کی طرف

صفحہ ہم سمجھتے ہیں کہ اتنا زیادہ عرصہ نہیں لگا تھا۔

سے مئی ۱۹۳۶ء کو مسلمانانِ پنجاب کے نام ایک اپیل مسلم لیگ اور مسٹر جناح کی حمایت میں علامہ اقبالؒ اور دیگر مسلم راہ نماؤں کے دستخطوں سے شائع ہوئی۔ اپیل کے سرنامہ علامہؒ کا یہ شعر درج تھا۔ ؎

گیا دورِ سرمایہ داری گیا تماشا دکھا کر مداری گیا

تمہیدی جملوں کے بعد اس اپیل میں کہا گیا تھا :-

> بطلِ جلیل، مسٹر محمد علی جناحؒ ان قابلِ فخر مسلم راہ نماؤں میں سے ہیں جن کی سیاسی جانش ہمیشہ مسلمانوں کے لئے صبر آزما و تونائیاں حق راہ کا کام دیتی رہی ہے۔ جس خلوص اور عزیمت سے انہوں نے مسلمانانِ ہند کی تمام اہم اور نازک موقعوں پہ خدمت کی ہے اس کے لئے مسلمانوں کی آنے والی نسلوں کے سر عقیدت و احترام سے جھکے رہیں گے۔
>
> (گفتارِ اقبالؒ۔ صفحہ ۲۰۳)

مارچ ۱۹۴۷ء میں بزمِ اقبالؒ کے سالانہ اجلاس میں، سر عبدالقادر (مرحوم) نے علامہ اقبالؒ کے ایک خط کے کچھ حصے پڑھ کر سنائے جو انہوں نے ایک دوست کے خط کے جواب میں بسترِ علالت سے ۱۹۳۵ء میں لکھا تھا۔ اس دوست نے علامہ کی صحت کی دعا کی تھی۔ علامہؒ نے لکھا تھا :-

> میرا وقت پورا ہو چکا ہے اور میرا پیغام ملت تک مکمل صورت میں پہنچ چکا ہے۔ میرے لئے صحت کی دعا مانگنے کے بجائے آپ قائدِ اعظمؒ محمد علی جناح اور کمال اتاترک کے لئے درازئ عمر کی دعا کیجئے کہ انہیں ابھی اپنا مشن پورا کرنا ہے۔
>
> (نوائے وقت۔ مورخہ ۹ر مارچ ۱۹۴۷ء)

۱۹۳۶ء میں پنڈت جواہر لعل نہروؔ علامہ اقبالؒ سے ملنے کے لئے آئے تو میاں افتخار الدین (مرحوم) بھی ان کے ساتھ تھے۔ مسلم لیگ کی تنظیم اور مسلمانانِ ہند کی قیادت کے موضوع پر گفتگو کے دوران، میاں افتخار الدین نے حضرت علامہؒ سے کہا کہ لیگ کی قیادت آپ خود اپنے ہاتھ میں کیوں نہیں لے لیتے؟ اس پر انہوں نے ایک ثانیہ کے توقف کے بغیر فرمایا کہ، "میں مسٹر جناحؒ کے ایک سپاہی کی حیثیت سے خدمات سرانجام دینا اپنے لئے باعثِ فخر سمجھتا ہوں"۔

یہ تھی علامہ اقبالؒ کی نگاہ میں قائدِ اعظمؒ کی قدر و منزلت۔ اب قائدِ اعظمؒ کی طرف آئیے اور دیکھئے کہ ان کے دل میں علامہ اقبالؒ کا کس قدر احترام تھا اور وہ انہیں کیا سمجھتے تھے۔ علامہ اقبالؒ کی وفات پہ قائدِ اعظمؒ نے انہیں اپنا رفیق، راہ نما، اور مفکر کہہ کر یاد کیا اور فرمایا کہ "تحریکِ پاکستان کی تاریخ میں جو تاریک ترین دور تھا وہ اس میں ایک چٹان کی طرح بجز دخزیدہ، محکم کھڑے رہے اور ان کے پائے ثبات میں ایک لمحہ کے لئے کبھی لغزش نہیں آئی"۔ اسی سال (دسمبر ۱۹۳۸ء میں) آل انڈیا مسلم لیگ کا مشہور اجلاس پٹنہ میں منعقد ہوا تو انہوں نے پھر علامہ اقبالؒ کی خدمت میں ان الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کیا۔

> علامہ اقبالؒ کی وفات مسلمانانِ ہند کے لئے ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے۔ مسلم لیگ ان کی وفات پہ پہلے ہی اظہارِ تعزیت کر چکی ہے۔ وہ میرے ذاتی دوست تھے اور ان کا شمار دنیا کے عظیم شاعروں میں ہوتا ہے۔ وہ اس وقت تک زندہ رہیں گے جب تک اسلام زندہ رہے گا۔ ان کی بلند پایہ شاعری مسلمانانِ ہند کی تمناؤں اور آرزوں کی ترجمان ہے۔ وہ ہمارے اور ہماری آنے والی نسلوں کے دلوں میں تازہ روح پھونکتی رہے گی۔
>
> (تقاریر محمد علی جناحؒ۔ صفحہ ۶۹)

انہوں نے ۱۹۴۰ء میں یومِ اقبالؒ کے اجلاس کی صدارت کرتے ہوئے، علامہ اقبالؒ کو ان الفاظ میں یاد فرمایا[1] :-

اقبالؒ میرا پرانا دوست تھا۔ آپ جانتے ہیں کہ آل انڈیا مسلم لیگ ابتدا میں ایک علمی سی جماعت تھی۔ ۱۹۳۶ء میں ہم میں سے بعض نے خیال کیا کہ اس جماعت کو صحیح پارلیمانی جماعت میں بدل دیا جائے۔ جب میں اپریل ۱۹۳۶ء میں پنجاب آیا تو پہلا شخص جسے میں ملا وہ اقبالؒ تھا۔ میں نے اپنے خیالات ان کے سامنے پیش کئے۔ انہوں نے فوراً لبیک کہا اور اس وقت سے تا دمِ مرگ وہ میرے ساتھ مضبوط چٹان کی طرح کھڑے رہے۔ علامہ اقبالؒ عظیم انسان اور بلاشبہ بہت بڑے فلاسفر تھے۔ جب تک مشرقی زبانیں موجود رہیں گی اقبالؒ کا کلام زندہ رہے گا۔ وہ خود ہندوستانی تھے لیکن دنیا میں شاعرِ اعظم کی حیثیت سے متعارف تھے۔ انہوں نے مسلم سیاسی شعور پیدا کرنے میں گراں بہا خدمات سرانجام دیں۔ میں اس کی ایک مثال بیان کرتا ہوں۔ ایک مرتبہ میں علی گڑھ میں ریل کا سفر کر رہا تھا.......

...... راستہ میں ایک چھوٹے سے سٹیشن پر گاڑی ٹھہری تو سینکڑوں کی تعداد میں دیہاتی جمع ہو گئے۔ میں حیران تھا کہ ان کے اجتماع کا مقصد کیا ہے کہ دفعتہً ان سب نے اقبالؒ کا یہ ترانہ پڑھنا شروع کر دیا۔

چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا

شعراء اقوام میں زندگی پیدا کرتے ہیں۔ ملٹن، شیکسپیئر، بائرن وغیرہ نے قوم کی بے بہا خدمت کی ہے۔ لیکن جہاں تک اسلام کا تعلق ہے اقبالؒ نے سب سے زیادہ خدمت کی ہے۔ کارلائل نے شیکسپیئر کی عظمت کا ذکر کرتے ہوئے ایک انگریز کا ذکر کیا ہے کہ اُسے جب شیکسپیئر اور دولتِ برطانیہ میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کا اختیار دیا گیا تو اس نے کہا کہ "میں شیکسپیئر کو کسی قیمت پر نہ دوں گا"۔ گو میرے پاس سلطنت نہیں لیکن اگر سلطنت مل جائے اور اقبالؒ اور سلطنت میں سے کسی ایک کو منتخب کرنے کی نوبت آئے تو میں اقبالؒ کو منتخب کروں گا"۔

قائد اعظم نے ۱۹۴۱ء کے یومِ اقبالؒ کی تقریب میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا :-

اگر میں اس تقریب (یومِ اقبالؒ) میں شامل نہ ہوتا تو اپنی ذات کے ساتھ بڑی ناانصافی کرتا۔ میں اپنی خوش قسمتی سمجھتا ہوں کہ مجھے اس جلسہ میں شریک ہو کر اقبالؒ کو عقیدت کے پھول پیش کرنے کا موقع ملا ہے۔ اقبالؒ کی ادبی شہرت عالم گیر ہے کہ وہ مشرق کے بہت بڑے بلند پایہ شاعر اور مفکرِ اعظم تھے۔ مرحوم دورِ حاضر میں اسلام کی تاریخ تھے۔ اس زمانہ میں اقبالؒ سے بہتر اسلام کسی اور شخص نے نہیں سمجھا۔ مجھے اس کا فخر ہے کہ میں نے ان کی قیادت میں بحیثیت ایک سپاہی کے کام کیا ہے۔ میں نے ان سے زیادہ وفادار اور اسلام کا شیدائی نہیں دیکھا۔ جس بات کو وہ صحیح خیال کرتے یقیناً وہ صحیح ہوتی تھی اور وہ اس بات پر مضبوط چٹان کی طرح قائم رہتے تھے[2]۔

انہوں نے ۱۹۴۴ء میں یومِ اقبالؒ کے موقعہ پر حضرتِ علامہ کو خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے فرمایا :-

---

[1] ان اقتباسات کی تدوین میں آغا حسین ہمدانی کی کتاب "قائد اعظمؒ" سے استفادہ کیا گیا ہے۔

[2] "انقلاب" ۲۹ مارچ ۱۹۴۰ء۔

[3] ہفتہ وار حمایتِ اسلام۔ ۴ مارچ ۱۹۴۱ء۔

میں اس دن جب کہ ہمارے عظیم ملّی شاعر اور مفکر، اقبالؒ کا یوم منایا جا رہا ہے، خلوصِ قلب سے انہیں خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ وہ ان کی روح کو بے پایاں رحمت سے ابدی سکون عطا فرمائے۔

(بحوالہ کتاب۔ قائدِ اعظمؒ۔ صہ ۵۳)

انہوں نے یومِ اقبال کی تقریب (منعقدہ لاہور، دسمبر ۱۹۴۴ء) پر حسبِ ذیل پیغام ارسال فرمایا:۔

اس تقریبِ سعید کے موقعہ پر، جو ہمارے عظیم ملّی، مردِ درویش، حکیم (الامت) اور مفکر کی حسین یاد منانے کے لئے منعقد کی جا رہی ہے، میں مرحوم کی بارگاہ میں قلبی خراجِ عقیدت پیش کرتا ہوں۔

وہ اگرچہ آج ہم میں زندہ موجود نہیں لیکن ان کی شاعری، جو یقیناً "لافانی ہے" ہماری راہنمائی اور روح پروری کیلئے ہر وقت ہمارے پاس ہے۔ ان کی شاعری، جس کا انداز نہایت حسین اور زبان نہایت شیریں ہے، اس عظیم شاعر کے قلب و دماغ کی صحیح تصویر ہمارے سامنے پیش کرتی ہے۔ اس سے ہمیں نظر آتا ہے کہ وہ اسلامی تعلیمات سے کس قدر سرشار اور اس کے کس حد تک وفا شعار تھے۔ وہ حضور نبی اکرمؐ کے ایک سچے اور پُرخلوص متبع تھے ——— وہ اوّل بھی مسلمان تھے اور آخر بھی مسلمان۔ وہ ترجمان الاسلام، بلکہ صوت الاسلام تھے۔

علامہ اقبالؒ ایک نظری مبلغ اور مفکر ہی نہیں تھے۔ وہ جراٴت اور عمل، استقامت اور خود اعتمادی کی محکم چٹان تھے۔ اور ان سے بھی بلند، خدا پر غیر متزلزل یقین اور اسلام کے ساتھ بے پناہ عقیدت کے پیکر۔ ان کی ذات میں ایک شاعر کے تخیلات اور ایک ایسے انسان کی حقیقت پسندی کے خواص مجتمع تھے جو حالات کا عملی نقطۂ نگاہ سے جائزہ لیتا ہے۔ عملِ پیہم اور (خدا پر) یقینِ محکم، یہ ہے ان کے پیغام کا خلاصہ۔ اور اس سے وہ ایک سچے مسلمان کی حیثیت سے (دُنیا کے سامنے) نمودار ہوتے ہیں۔ اسلامی اصولوں (کی محکمیت) پر انہیں غیر متزلزل یقین تھا۔ کامیابی سے ان کی مراد، تعمیرِ خودی تھی۔ اور ان مقاصد کے حصول کا ذریعہ، اسلامی تعلیمات کا اتباع ——— تعمیرِ خودی اور عملِ پیہم، نوعِ انسان کے نام ان کا پیغام تھا۔

وہ اگرچہ ایک عظیم شاعر تھے، لیکن اس کے ساتھ ہی وہ ایک عملی سیاستدان بھی تھے۔ وہ اسلامی اصولوں پر ایمانِ کامل اور یقینِ محکم کی بنا پر، ان چند افراد میں سے تھے جنہوں نے سب سے پہلے یہ خیال پیش کیا کہ ہندوستان کے شمال مغربی اور شمال مشرقی علاقوں کو الگ کر کے ایک اسلامی مملکت متشکل کی جا سکتی ہے۔ یہ علاقے مسلمانوں کے تاریخی اماکن بھی ہیں۔

میں اقبال ڈے کی اس تقریب میں عمیق قلب سے شریک ہوں۔ اور دعا کرتا ہوں کہ ہم اپنے اس ملّی شاعر کے پیش کردہ نظریات پر عمل پیرا ہوں، تاکہ جب مملکتِ پاکستان متشکل ہو تو ہم ان نظریات کو عملی قالب میں ڈھال سکیں۔[1]

علامہ اقبالؒ نے قائدِ اعظمؒ کو جو خطوط، مئی ۱۹۳۶ء اور نومبر ۱۹۳۷ء کے دوران لکھے تھے، ان کا مجموعہ شائع ہوا تو قائدِ اعظمؒ نے اس کا پیش لفظ خود تحریر فرمایا۔ چونکہ یہ پیش لفظ، علاوہ اس حقیقت کے کہ اس میں علامہ اقبالؒ کی ان

---

[1] اس پیغام کی اصل، مرکزیہ مجلسِ اقبالؒ (لاہور) کی طرف سے شائع کردہ کتاب (IQBAL THE POET - OF TOMORROW) میں شامل ہے۔

خدمات کو سراہا گیا ہے جو انہوں نے لیگ کے پیشِ نظر ملی مقاصد کے سلسلہ میں سرانجام دیں، خود قائدِ اعظمؒ کے الفاظ میں اس دور کے اہم واقعات کی بھی نشاندہی کرتا ہے، اس لئے ہم نے مناسب سمجھا ہے کہ اس کا پورا ترجمہ پیشِ خدمت قارئین کر دیا جائے۔[1]

"یہ خطوط جو اس کتاب میں شامل ہیں وہ ہمارے قومی شاعر، فلسفی اور دانشور مرحوم ڈاکٹر سر اقبالؒ نے مئی ۱۹۳۶ء سے نومبر ۱۹۳۷ء کے درمیانی عرصہ میں مجھے تحریر کئے تھے۔ یہ بات ان کی وفات سے چند ماہ قبل کی ہے۔ یہ عرصہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ کے ایسے دور کے ساتھ آیا ہے جو نہایت اہم واقعات سے پُر ہے۔ یعنی کل ہند مسلم لیگ مرکزی پارلیمانی بورڈ کے قیام واقعہ جون ۱۹۳۶ء اور اکتوبر ۱۹۳۷ء کے تاریخی اجلاس لکھنؤ کا درمیانی وقفہ۔ مرکزی پارلیمانی بورڈ اور اس کی صوبائی شاخیں پہلی بڑی کوشش تھی کہ قانونِ حکومتِ ہند مجریہ ۱۹۳۵ء کے تحت ہونے والے آئندہ انتخابات کے لئے مسلمانوں کی رائے عامہ ہموار کی جائے، جس کے تحت صوبائی اسمبلیوں کے لئے لیگ کے ٹکٹ جاری کئے گئے تھے۔ اگر یہ پہلا اہم قدم تھا تو دوسرا بڑا قدم جو اٹھایا گیا وہ اجلاس لکھنؤ میں یہ مرحلہ طے کرنا تھا کہ مسلم لیگ کو کس طرح از سرِ نو منظم کیا جائے تاکہ وہ مسلم ہند کی واحد با اختیار نمائندہ جماعت بن جائے۔ دیگر حضرات کے علاوہ سر محمد اقبالؒ نے اپنے جذبۂ قومی اور بے غرضانہ و مخلصانہ مساعی سے جو میری مدد کی اس نے ان اعلیٰ مقاصد کے حصول میں بڑا کام کیا اور لیگ اتنے قلیل عرصہ میں برابر قوت پکڑتی چلی گئی۔ ان تمام صوبوں میں جہاں لیگ پارلیمانی بورڈ قائم کئے گئے۔ اور لیگ پارٹیاں بنائی گئیں، لیگ کے اُمیدواروں نے مقابلے میں شرکت کی اور جس قدر نشستوں کے لئے انتخاب لڑے ان میں سے ساٹھ تا ستر فی صد تک نشستیں جیت لیں۔ پھر تقریباً تمام صوبوں میں مدراس سے لے کر صوبہ شمال مغربی سرحد تک سینکڑوں ابتدائی اور اضلاعی لیگیں قائم ہو گئیں۔ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کرنے اور لیگ کو اپنے سامنے جھکانے کی نیت سے کانگریس نے عوامی رابطہ کی تحریک شروع کر دی تھی۔ اس کے باوجود لیگ نے بیشتر ضمنی انتخابات بھی جیت لئے اور جو لوگ ریشہ دوانیوں اور عیارانہ سازشوں کے ذریعے یہ ثابت کرنے کی فکر کر رہے تھے کہ لیگ کے نظام کو مسلمانوں کی تمام حمایت حاصل نہیں، ان سب کی اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ اجلاس لکھنؤ سے قبل اٹھارہ مہینے کے اندر اندر مسلم لیگ اس بات میں کامیاب ہو چکی تھی کہ مسلمانوں کو ایک پارٹی کی طرح منظم کر دے اور اس کا ایک ترقی پسندانہ اور ترقی پذیر پروگرام بھی وجود میں آ گیا اور اس کے زیرِ اثر ایسے صوبے بھی آ گئے جو وقت کی کمی یا تیاری کی کمی کے باعث ابھی تک لیگ پارلیمانی بورڈوں کی سرگرمیوں سے پورا پورا فائدہ نہ اٹھا سکے تھے۔ مسلمانوں کے تمام طبقوں اور گروہوں میں مسلم لیگ کو کتنی مقبولیت حاصل تھی، اجلاس لکھنؤ نے اس کا ناقابلِ تردید ثبوت بھی مہیا کر دیا۔ مسلم لیگ کی یہ بھی بہت بڑی کامیابی تھی کہ اکثریتی اور اقلیتی دونوں ہی صوبوں میں اس کی رہنمائی کی اہمیت تسلیم کی گئی۔ سر محمد اقبالؒ نے اس مجموعی کامیابی کے پیدا کرنے میں بڑا امتیازی کردار ادا کیا، گو اسے اس وقت عوام کے سامنے نہیں لایا گیا تھا۔ سکندر۔ جناح سمجھوتہ پر عمل درآمد کے سلسلے میں ان کے اپنے کچھ شکوک تھے اور انہیں اس بات کی بڑی تشویش تھی کہ بغیر التواء کے اس کے نتائج کو کسی معقول شکل میں اُبھرتا ہوا دیکھیں تاکہ اس کے بارے میں عوام کے شبہات و خدشات دُور ہوں۔

---

[1] یہ ترجمہ آغا حسین ہمدانی کی کتاب "قائدِ اعظمؒ" میں شامل ترجمہ پر مبنی ہے۔

بلکہ افسوس کہ وہ یہ دیکھنے کے لئے زندہ نہ رہے کہ پنجاب میں ہمہ گیر ترقی ہوئی ہے اور اب یہ بات شک سے بالاتر ہے کہ مسلمان مضبوطی کے ساتھ لیگ کے نظام کے ساتھ ہیں ۔

اس مختصر تاریخی پس منظر کے بعد ان خطوط کو بڑی دلچسپی کے ساتھ پڑھا جائے گا ۔ مگر اس بات کا افسوس ہے کہ میں نے اقبالؒ کو جو جوابات بھیجے تھے وہ دستیاب نہیں ہیں ۔ زیر نظر زمانہ میں میں بالکل تن تنہا کام کرتا تھا اور مجھے ذاتی سٹاف کی مدد تک میسر نہ تھی ۔ اس لئے مجھے جس قدر خطوط کے جوابات دینے پڑتے تھے ان کی نقول بھی اپنے پاس نہ رکھ سکا ۔ لاہور میں میں نے اقبالؒ ٹرسٹ کے لوگوں سے دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ میرے جوابات ادھر بھی دستیاب نہیں ۔ لہٰذا میرے لئے اس کے سوا کوئی صورت نہ رہ گئی تھی کہ ان خطوط کو بغیر اپنے جوابات کے ہی شائع کر دوں کیونکہ ان کی تاریخی اہمیت بہت بڑی ہے ۔ بالخصوص وہ خطوط جن میں انہوں نے بالکل واضح اور غیر مبہم طور پر مسلم ہندوستان کے سیاسی مستقبل کے سلسلے میں اپنی آراء کا اظہار کیا ہے ۔ ان کے خیالات مجموعی طور پر میرے خیالات سے ہم آہنگ تھے اور ہندوستان کو جو آئینی مسائل درپیش تھے ان کے گہرے مطالعے اور غور و خوض کے بعد آخرؔ میں بھی ان ہی نتائج تک پہنچا جو سر اقبالؒ کے تھے ۔ یہی تصورات تھے جو اپنے وقت پر کر مسلمانانِ ہند کے متفقہ ارادے کی شکل میں نمودار ہوئے اور لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کی اس قرار داد کی صورت اختیار کر گئے جسے عام طور پر قرار دادِ پاکستان کہا جاتا ہے اور جو ۲۳ ، مارچ سن۱۹۴۰ء کو منظور کی گئی تھی ۔"

ان تصریحات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے دل میں ایک دوسرے کا کس قدر احترام اور عزت و توقیر تھی ۔ ایک طرف انہیں دیکھئے اور دوسری طرف موجودہ دور کی مہکیاولی سیاست کو دیکھئے جس میں ہر لیڈر دوسرے لیڈر کی ٹانگ کھینچنے اور اس پر کیچڑ اچھالنے کی فکر اور کاوش میں سرگرم عمل رہتا ہے ۔ ان دونوں (اوّل الذکر اور آخر الذکر) کے کردار میں اس قدر تفاوت کیوں ہے ؟ اس لئے کہ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظمؒ کے پیشِ نظر کسی ذاتی مقصد یا مفادِ خویش کا حصول نہیں تھا ۔ ان کے سامنے صرف ملت کی فلاح اور منفعت تھی ۔ اور چونکہ یہ ان دونوں کا مشترک مقصد تھا اس لئے وہ ایک دوسرے کی بانہوں میں بانہیں ڈال کر ، جانبِ منزل رواں دواں تھے ۔ میکیاولی سیاست میں ہر پارٹی اور ہر لیڈر کے سامنے اپنا اپنا گروہ بندانہ مقصد یا ذاتی مفاد ہوتا ہے اس لئے ان میں باہمی رقابت اور عداوت کے جذبات کارفرما رہتے ہیں ۔ سوچئے کہ اگر کہیں (خدانخواستہ) اقبالؒ اور جناحؒ کی بھی یہی صورت ہوتی ، اور وہ دونوں پہاڑ ایک دوسرے سے ٹکرا جاتے تو اس میں قوم جس بُری طرح پستی ، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا ۔ مشترکہ مقصد اور اس کے حصول کے لئے مخلصانہ تعاون ، یہ ہیں وہ جوہر جن سے وہ کیفیت پیدا ہوتی ہے جسے قرآن کریم نے اَلَّفَ بَیۡنَ قُلُوۡبِکُمۡ ــــ ائتلافِ قلبی ــــ سے تعبیر کیا ہے ۔ مملکتِ پاکستان ، ان دونوں اربابِ بصیرت و عزیمت کے اسی ائتلافِ قلبی کا فطری نتیجہ ہے ۔ سچ ہے :-

محبت چوں تمام افتد رقابت از میاں خیزد
بطوفِ شعلہ ، پروانہ با پروانہ می سازد

باسمہٖ تعالیٰ

تباؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے؟

مومن کی زندگی

(قرآن کے آئینے میں)

پرویز

مومن کی زندگی

(قرآن کے آئینے میں)

پرویز

قرآن کریم کی تعلیم انسان کو کیا بنا دیتی ہے، اس کی تفصیل میں جائیے تو کئی مجلدات درکار ہوں گی لیکن اگر اسے اجمالی طور پر بیان کرنا چاہیں تو اس سے بہتر، جامع اور حسین انداز میں کچھ اور نہیں کہا جا سکتا جسے علامہ اقبالؒ نے اس ایک مصرعہ میں سمو دیا ہے کہ

آنچہ حق می خواہد، آں سازد ترا

قرآن کی تعلیم انسان کو وہ کچھ بنا دیتی ہے جو کچھ خدا چاہتا ہے کہ یہ بن جائے یعنی جس مقصد کے لئے انسان کو پیدا کیا گیا ہے وہ مقصد پورا ہو جائے۔ اس کے سفرِ حیات کے لئے، جو منزل مقرر کی گئی ہے یہ اس منزلِ منتہیٰ تک پہنچ جائے۔ انسان اور دیگر حیوانات کی تخلیق میں ایک بنیادی فرق ہے۔ دُنیا کے ہر حیوان نے جو کچھ بننا ہوتا ہے

انسان اور حیوان میں فرق

وہ از خود وہ کچھ بن جاتا ہے۔ اس کے لئے اسے نہ کسی تعلیم و تربیت کی ضرورت ہوتی ہے، نہ سعی و کاوش کی حاجت۔ فطرت نے اس کے اندر جو کچھ بننے کے امکانات رکھے ہیں، وہ امکانات از خود بتدریج مشہود ہوتے چلے جاتے ہیں تا آنکہ ایک عمر تک پہنچ کر، وہ حیوانی بچہ، اپنی نوع کا مکمل فرد بن جاتا ہے —— شیر کا بچہ شیر بن جاتا ہے۔ بکری کا بچہ بکری۔ لیکن انسانی بچے میں فطرت نے جو مضمر صلاحیتیں رکھی ہوتی ہیں، ان کی دو قسمیں ہیں۔ ایک حیوانی یا طبیعی صلاحیتیں۔ یہ دیگر حیوانات کی طرح از خود نشوونما پا کر، ایک منتہیٰ تک پہنچ جاتی ہیں۔ اور وہ بچہ بالآخر آدمی بن جاتا ہے۔ دوسری صلاحیتیں انسانی ہیں۔ یہ از خود نشوونما نہیں پاتیں۔ انہیں مناسب تعلیم و تربیت سے نشوونما دے کر اجاگر کرنا ہوتا ہے۔ قرآن کریم وہ پروگرام دیتا ہے جس سے فرد کی وہ مضمر صلاحیتیں پوری پوری نشوونما پا کر مشہود ہو جاتی ہیں اور پھر وہ انہیں ان مقاصد کے لئے صرف کرتا ہے جو اس کے لئے متعین کئے گئے ہیں۔ جب وہ اس مقام پر پہنچ جائے کہ انسان وہ کچھ بن گیا جو کچھ بننا اس کے لئے مقصود و مطلوب تھا۔ قرآن نے ایسے فرد کو مردِ مومن کہہ کر پکارا ہے اور انسان کی اس ہیئت کو احسن تقویم قرار دیا ہے (۹۵/۴)۔ یعنی ایسی ہیئت جو حسن و توازن میں انتہا تک پہنچ

مومن

گئی ہو۔ جن خصوصیات کے مظہر یہ افراد ہوں انہیں صفاتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ اور جب یہ خصوصیات محسوس شکل میں سامنے آئیں تو انہیں اعمالِ صالح سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی ایسے کام جو اس فرد کی بھرپور انسانی

صلاحیتوں کے اثمار و نتائج ہوں اور جن سے عالمِ انسانیت کے بگڑے ہوئے معاملات سنور جائیں۔ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہو، اسے قرآن نے خَيْرَ أُمَّةٍ (۳/۱۱۰) "بہترین قوم جسے نوعِ انسان کی بہبود کے لئے پیدا کیا گیا ہے" قرار دیا ہے اور اُمَّةً وَّسَطًا (۲/۱۴۳) "یعنی ایسی قوم جسے عالمِ انسانیت میں مرکزی حیثیت حاصل ہو" کا مقام دیا ہے۔ سطحی نظر سے دیکھئے تو معاشرہ، جماعت یا اُمّت، افراد ہی کے مجموعہ کا نام ہوتی ہے، لیکن اجتماعی نفسیات پر نگاہ رکھنے والے جانتے ہیں کہ جماعت، افراد کی حاصل جمع (SUM TOTAL) کا نام نہیں ہوتی۔ اس کی اپنی خصوصیات ہوتی ہیں۔ اس لئے قرآن، افراد کی خصوصیات کے علاوہ، جماعتِ مومنین کی خصوصیات کا ذکر بھی خاص طور پر کرتا ہے۔ یا یوں کہئے کہ وہ افراد کی تعلیم، تربیت اور نشو و نما کے علاوہ، ان اصول و ضوابط کی بھی وضاحت کرتا ہے جن کے مطابق ان افراد نے اجتماعی امور سرانجام دینے ہوتے ہیں اور جن کی بناء پر وہ ایک منفرد جماعت بنتے ہیں۔

اُمّت کی خصوصیات

اور حقیقت یہ ہے کہ یہی وہ مقام ہے جہاں قرآنی تعلیم کی انفرادیت اور بے مثالیت نکھر کر سامنے آتی ہے اور اسی مقام کے سامنے نہ ہونے سے اچھے اچھے سمجھدار لوگوں کو بھی یہ دھوکا لگ جاتا ہے کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"۔ "عالمگیر سچائیوں" سے ان کی مراد ہوتی ہے عام اخلاقی اصول — مثلاً جھوٹ نہ بولو۔ چوری نہ کرو۔ کسی کو ستاؤ نہیں۔ وغیرہ وغیرہ۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ یہی اخلاقی اصول قرآن پیش کرتا ہے اور یہی تعلیم دنیا کے دیگر مذاہب میں بھی پائی جاتی ہے تو وہ پکار اٹھتے ہیں کہ "عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پر پائی جاتی ہیں"۔ لیکن وہ یہ نہیں دیکھتے کہ جس اجتماعی نظام میں ان اخلاقی اصولوں کے حامل افراد زندگی بسر کرتے ہیں، اس نظام کے اصول کیا ہیں۔ مثال کے طور پر سمجھئے کہ ایک برہمن جھوٹ نہیں بولتا، چوری نہیں کرتا، انسان تو ایک طرف، کیڑوں مکوڑوں تک کو بھی نہیں ستاتا۔ لیکن جس اجتماعی نظام کا وہ فرد ہے اس کا اصول یہ ہے کہ پیدائش کے اعتبار سے انسان اور انسان میں اس قدر گہرا اور بنیادی فرق ہوتا ہے کہ برہمن کے گھر میں پیدا ہونے والا بچہ ساری عمر دوسروں سے اپنی پرستش کراتا ہے اور شودر کے ہاں جنم لینے والا بچہ، تمام عمر، دوسروں کی خدمت اور بیگار میں بسر کر دیتا ہے۔ اور یہ فرق اس قدر غیر متبدل ہوتا ہے کہ شودر کے گھر میں پیدا ہونے والے بچے کے جوہرِ ذاتی اور اس کی ہزار محنت اور کوشش اس فرق کو مٹا نہیں سکتی۔ آپ کہئے کہ جو معاشرہ اس اجتماعی اصول کے مطابق متشکل ہو، اس میں افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" کہ وہ جھوٹ نہیں بولتے اور چوری نہیں کرتے، کیا خوشگوار نتائج پیدا کر سکتی ہیں؟ افراد کی اس قسم کی "نیکیاں" محدود سے انفرادی حلقہ میں قدرے سکون پیدا کر سکتی ہیں۔ لیکن نہ تو یہ انسان کو اس کا صحیح مقام دینے کے قابل بن سکتی ہیں اور نہ ہی عالمگیر انسانیت کی فوز و فلاح کا موجب۔ حتیٰ کہ یہ اس باطل نظام کو تباہی سے بچا سکنے کے قابل بھی نہیں ہو سکتیں جس کے اندر وہ "نیک انسان" زندگی بسر کرتا ہے۔ یا مثلاً جس معاشرہ کا اصول یہ ہو کہ جو بچہ بنی اسرائیل (یہودیوں) کے ہاں پیدا نہ ہو، وہ نجات و سعادت حاصل نہیں کر سکتا۔ اس معاشرہ میں افراد کی اس قسم کی نیکیاں کہ وہ جھوٹ نہیں

نظام اور فرد

لے ترجمان القرآن - ابوالکلام آزاد مرحوم۔

برتتے اور چوری نہیں کرتے۔ عالمِ انسانیت کے کس کام آسکتی ہیں؟ یا جس معاشرہ میں عقیدہ یہ ہو کہ ہر انسانی بچہ پیدائشی طور پر گنہگار پیدا ہوتا ہے اور اس کے گناہوں کا یہ داغ، "خدا کے بیٹے" (حضرت مسیحؑ) کے کفارہ پر ایمان سے ہی دھل سکتا ہے۔ اس کے سوا، اس داغ کے مٹنے کی کوئی صورت نہیں، اس معاشرہ میں لوگوں کا حلیم الطبع اور منکسر المزاج ہونا، شرفِ انسانیت کی دلیل کیسے بن سکتا ہے؟ دنیا کے مذاہب سے الگ ہٹ کر دیکھئے اور سوچئے کہ کیا نظامِ ملوکیت میں، ایک بادشاہ کے لئے

باطل کا نظام اور انفرادی نیکیاں

جو کروڑوں انسانوں پر اپنی مرضی چلاتا ہے، یہ بات موجبِ فخر قرار پاسکتی ہے کہ اس نے ساری عمر تہجد قضا نہیں کی یا شراب نہیں پی؟ نظامِ سرمایہ داری میں، اگر ایک جاگیردار۔ زمیندار یا کارخانہ دار، جو ہزاروں محنت کش غریبوں کے گاڑھے پسینے کی کمائی سمیٹ کر لے جاتا ہے، یہ کہتا ہے کہ اس نے کبھی چوری نہیں کی، تو کیا اسے نیک انسان کہا جاسکتا ہے؟ اگر ایک مذہبی پیشوا، جو دن رات عوام کو اس قسم کے عقائد کی تعلیم دیتا رہتا ہے کہ امیری اور غریبی انسان کی تقدیر سے وابستہ ہے جسے خود خدا نے مقرر کیا ہے اور خدا کے لکھے کو کوئی مٹا نہیں سکتا، اور اس کے ساتھ کہتا ہے کہ اس نے ساری عمر جھوٹ نہیں بولا، تو کیا آپ سمجھتے ہیں کہ اس کی یہ انفرادی نیکی، انسانیت کی اجتماعی میزان میں کوئی وزن رکھے گی؟ ان مثالوں سے آپ اندازہ لگا لیجئے کہ جن انفرادی اخلاقی خوبیوں کو "عالمگیر سچائیاں" کہہ کر اسلام کو مذاہبِ عالم کی صف میں ہم دوش کھڑا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، غلط اجتماعی نظام میں ان کی حقیقت کیا رہ جاتی ہے؟ اصل یہ ہے کہ مذہب اور دین میں بنیادی فرق یہ ہے کہ مذہب، انفرادی ضابطہ اخلاق کا علمبردار ہوتا ہے اجتماعی نظام سے اسے سروکار نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس "دین" اجتماعی نظامِ انسانیت کو سامنے رکھتا ہے اور افراد کی اخلاقی خوبیوں کو اس لئے ضروری قرار دیتا ہے کہ اس سے اس معاشرہ کا توازن قائم رہے جو عالمگیر انسانیت کی سلامتی اور ارتقاء کا ضامن ہے، اور یوں انسان وہ کچھ بن جائے جو کچھ بن سکنے کا اس میں امکان ہے۔

قرآن کی جامع تعلیم

جو کچھ اوپر کہا گیا ہے اس سے واضح ہے کہ

(۱) جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کی پابندی نہیں کرتے، اس معاشرہ میں کسی کو امن اور سکون نصیب نہیں ہوسکتا اور خود معاشرہ کی بنیادیں متزلزل ہوجاتی ہیں۔

(۲) جس معاشرہ میں افراد عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، لیکن خود معاشرہ، غلط اجتماعی اصولوں پر متشکل ہو، اس میں عام معاشرتی روابط میں تو قدرے سکون حاصل ہوسکتا ہے لیکن نہ تو اس معاشرہ کی بنیادیں مستحکم ہوتی ہیں، اور نہ ہی اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجبِ رحمت بن سکتا ہے۔ اور

(۳) جس معاشرہ میں افراد، عام اخلاقی ضوابط کے پابند ہوں، اور خود معاشرہ بھی صحیح اجتماعی اصولوں کا علمبردار ہو، اس میں افرادِ معاشرہ کو حقیقی امن و سکون میسر ہوتا ہے۔ ان کی طبیعی اور انسانی صلاحیتیں نشوونما پاکر بارآور ہوتی چلی جاتی ہیں۔ اور اس کا وجود عالمگیر انسانیت کے لئے موجبِ فلاح و سعادت ہوتا ہے۔

قرآن کریم اسی قسم کا معاشرہ قائم کرنا چاہتا ہے جس میں افرادِ معاشرہ عام اخلاقی اصولوں کے شدت کے ساتھ پابند ہوں، اور جو معاشرہ ان افراد پر مشتمل ہو، وہ ان مستقل اقدار کا حامل ہو جو عالمگیر انسانیت کو

اس کی منزلِ مقصود تک لے جائے۔ اور یہ ہے قرآن کا وہ نظام جس کی مثال کسی اور جگہ نہیں مل سکتی۔ قرآنی تعلیم اپنی اس خصوصیتِ کبریٰ کی بناء پر بے مثل و منفرد ہے۔ قرآن میں مومنین کی ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر اس تفصیل، کثرت اور تکرار سے آیا ہے کہ اس سے افراد کی سیرت و کردار کا صحیح نقشہ اور جماعتِ مومنین (اسلامی معاشرہ) کا بیّن اور واضح تصور سامنے آجاتا ہے۔ اکثر مقامات پر ان انفرادی اور اجتماعی خصوصیات کا ذکر الگ الگ آیا ہے لیکن بعض مقامات پر ایک دوسرے میں یوں سموئی ہوئی سامنے آتی ہیں۔ جیسے ایک حسین وشاداب شجرِ طیب کہ اگر اس کی شاخوں، پتیوں، پھولوں اور شگوفوں کو الگ الگ بھی دیکھا جائے تو پورے کا پورا درخت باعثِ شادابیٔ قلب و نظر ہو جائے اور اگر اس سرسبز و شاداب درخت پر بہ حیثیتِ مجموعی نگاہ ڈالی جائے تو اس کی تمام پھول پتیوں کی نزہت و لطافت وجہِ نشاطِ روح بن جائے۔ آئندہ سطور میں، ان افراد کی بعض نمایاں خصوصیات کا ذکر کیا جاتا ہے جنہیں قرآن مومن کہہ کر پکارتا ہے۔ اس مقصد کے لئے کہ ہم ان خصوصیات کی روشنی میں، اپنی سیرت و کردار پر نگاہ ڈالیں اور دیکھیں کہ وہ کس حد تک ان کے آئینہ دار ہیں۔ اس لئے کہ جس طرح عرقِ گلاب اُسے کہا جائے گا جس میں گلاب کی خوشبو اور خصوصیات ہوں۔ اگر اس میں یہ صفات نہ ہوں تو وہ عرقِ گلاب نہیں ہوگا پانی ہوگا، خواہ اس بوتل پر کیسے ہی خوبصورت لیبل پر سنہرے حروف میں "عرقِ گلاب" لکھا ہو۔ اسی طرح مومن وہ کہلائے گا جو مومن کی صفات کا حامل ہو۔ یہی وہ معیار ہے جس پر ہم اپنے مومن ہونے کے دعوے کو پرکھ سکتے ہیں۔ اور ان صفات کے تذکرہ سے یہی مقصود ہے۔

سب سے پہلے معاشرہ کے روزمرہ کے معاملات اور روابط کو لیجئے اور دیکھئے کہ قرآنِ کریم ان امور کو بھی کس قدر اہمیت دیتا ہے جنہیں عام طور پر قابلِ اعتنا نہیں سمجھا جاتا لیکن جن سے معاشرہ میں بڑی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ جماعتِ مومنین سے تاکید کرتا ہے کہ

تمسخر نہ اڑاؤ

لَا يَسْخَرْ قَوْمٌ مِّنْ قَوْمٍ (۴۹/۱۱)

کوئی جماعت، دوسری جماعت کا تمسخر نہ اڑائے

آپ جانتے ہیں کہ تمسخر، جسے ہمارے ہاں بڑا (LIGHTLY) لیا جاتا ہے، کتنے بڑے فساد کا موجب بن جاتا ہے۔ تمسخر درحقیقت ایک گہری نفسیاتی کیفیت کا مظاہرہ ہوتا ہے، جو نفرت، حسد، اور انتقام کے جذبات کی پیدا کردہ ہوتی ہے۔ لیکن اس شخص میں اتنی جرأت نہیں ہوتی کہ وہ ان جذبات کا اظہار کھلے بندوں کرے۔ وہ انہیں تمسخر کے فریب کارانہ پردوں میں چھپا کر پیش کرتا ہے۔ تمسخر کے تیر ترنشتر کی شکل وہ ہوتی ہے جسے کسی کا "نام رکھنا" کہتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہہ کر اس سے بھی روک دیا کہ وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ (۴۹/۱۱)۔ ایک دوسرے کے بُرے بُرے نام مت رکھا کرو۔

(۲) اس کے بعد ہے

وَلَا تَلْمِزُوْا اَنْفُسَكُمْ (۴۹/۱۱)

اور آپس میں ایک دوسرے پر الزام مت لگاؤ۔

الزام تراشی

الزام تراشی کس قدر سنگین جرم ہے اس کا اندازہ اس سے لگائیے کہ قرآن کی رُو سے زنا کی سزا سو کوڑے ہے اور پاک دامن عورتوں کے خلاف الزام تراشی کی سزا اسی کوڑے۔ ہوتا یہ ہے کہ دوسرے پر الزام لگانے والا، خود تو معتبر بن جاتا ہے اور فریق مقابل کو خواہ مخواہ ملزموں کے کٹہرے میں کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ اپنی بریت ثابت کرے۔ اس سے اور کچھ نہیں تو اکثر لوگوں کے دل میں اس شخص کے خلاف بدظنی ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ اور وہ یہ کہنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ بھائی! بالآخر کچھ نہ کچھ بات تو ہو گی ہی جس کی بنا پر یہ الزام لگایا گیا ہے!

تا نہ باشد چیزکے گویند مردان چیزہا

بدظنی سے بچو

قرآن کریم نے ایک طرف الزام تراشی اور بہتان بافی کی اس قدر سخت سزا مقرر کی، اور دوسری طرف جماعتِ مومنین سے تاکید کی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اجْتَنِبُوا كَثِيرًا مِّنَ الظَّنِّ إِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ إِثْمٌ ۔

اے جماعتِ مومنین! بدظنی سے بہت زیادہ بچو۔ یاد رکھو! بعض بدظنی بدترین گناہ تک پہنچ جاتی ہے۔

اسلامی معاشرہ کے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے متعلق ہمیشہ خیر سگالی کے جذبات ہونے چاہئیں۔ لیکن جس دل میں کسی کے متعلق بدظنی پیدا ہو جاتی ہے، اس میں خیر سگالی کے جذبات باقی نہیں رہتے۔ اس کا علاج قرآن نے یہ بتایا ہے کہ (۱) ہر شخص کے متعلق تمہارا پہلا ردِّ عمل (FIRST REACTION) نیک ہونا چاہیے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ أَلْقَىٰ إِلَيْكُمُ السَّلَامَ لَسْتَ مُؤْمِنًا ۔ جو تمہیں سلام کہے اس کے متعلق، یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ اگرچہ یہ آیت، جنگ کے سلسلہ میں ایک اور اہم اصول کی وضاحت کرتی ہے لیکن جب اس کا اطلاق عام معاشرتی روابط پر کیا جائے گا تو اس کا مطلب یہی ہو گا کہ (تحقیق سے پہلے) تمہارا پہلا ردِّ عمل، ہمیشہ نیک ہونا چاہیئے۔ قرآن کے اسی حکم پر مبنی عمل کا یہ اہم اصول قائم ہوتا ہے کہ جب تک کسی کے خلاف جرم ثابت نہ ہو جائے اسے بے گناہ سمجھنا چاہیئے۔ اس سلسلہ میں اس نے کہا کہ جب کوئی شخص، تم سے کسی کے خلاف کوئی بات کہے تو تمہارا پہلا ردِّ عمل یہ ہونا چاہیئے کہ هَٰذَا إِفْكٌ

مومن کا پہلا ردِّ عمل

مُّبِينٌ ۔ یہ صریح جھوٹ ہے۔ هَٰذَا بُهْتَانٌ عَظِيمٌ ۔ یہ بہت بڑا بہتان ہے۔ اپنے دل میں ردِّ عمل یہ پیدا کرو، اور پھر اس بات کا چرچا مت کرو۔ اگر بات ایسی ہے کہ وہ بالبداہت غلط نظر آتی ہے تو اس کے متعلق خواہ مخواہ کی کرید مت کرو۔

تحقیق کرو

وَلَا تَجَسَّسُوا ۔ لیکن اگر اس کے متعلق کسی حتمی نتیجہ تک پہنچنا ضروری ہے تو اس کی تحقیق کرو۔ اس تحقیق کے متعلق قرآن نے خصوصیت سے کہا ہے کہ

وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهِ عِلْمٌ ۚ إِنَّ السَّمْعَ وَالْبَصَرَ وَالْفُؤَادَ كُلُّ أُولَٰئِكَ كَانَ عَنْهُ مَسْئُولًا ۔

جس معاملہ کی تم خود تحقیق نہ کر و اس کے پیچھے مت لگا کرو۔ یاد رکھو! تمہاری سماعت۔ بصارت۔ قلب (کان، آنکھ اور دل) ہر ایک سے پوچھا جائے گا (کہ آیا تم نے ان سے کام لے کر اس معاملہ

کی تحقیق کر لی تھی یا نہیں)۔
اور اگر معاملہ ایسا ہے جس کا اثر جماعتی زندگی پر بھی پڑتا ہے تو اسے متعلقہ حکام تک پہنچاؤ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنْبِطُونَهُ مِنْهُمْ (۴/۸۳) تاکہ وہ تحقیق کر کے بات کی تہ تک پہنچ جائیں (نیز ۴۹/۶)۔ اسی سلسلہ میں قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے

غیبت مت کرو

وَلَا يَغْتَبْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا (۴۹/۱۲)۔ تم ایک دوسرے کی غیبت مت کرو۔ کسی کی پیٹھ پیچھے اس کے خلاف کوئی بات نہ کرو۔ جو بات کہنی ہو اس کے سامنے کہو۔ اگر آپ سے کوئی شخص، کسی کی غیر حاضری میں اس کے خلاف کوئی بات کہتا ہے تو آپ کا فریضہ ہے کہ اس سے کہو کہ چلو! یہ بات اس شخص کے سامنے چل کر کرو۔ آپ دیکھیں گے کہ اس سے آپ کتنے بڑے فساد کا رخنہ بند کر دیتے ہیں۔

اذیت مت پہنچاؤ

کسی کے خلاف جھوٹے الزام لگانے، یا اس کی غیبت کرنے سے اسے جس قدر قلبی اذیت پہنچ سکتی ہے، اس کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ مومن ایک دوسرے کے لئے قلبی سکون اور مسرت کا موجب ہونے چاہئیں، نہ کہ باعثِ اذیت و کوفت۔ اسی لئے فرمایا۔

وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ الْمُؤْمِنِينَ وَالْمُؤْمِنَاتِ بِغَيْرِ مَا اكْتَسَبُوا فَقَدِ احْتَمَلُوا بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ○ (۳۳/۵۸)۔

جو لوگ مومن مردوں اور عورتوں کو بلا جرم و خطا، ناحق اذیت پہنچاتے ہیں، تو وہ بہتان تراشی کے جرم کے مرتکب ہوتے ہیں اور کھلے ہوئے گناہ کا کام کرتے ہیں۔

اس نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ لَا يُحِبُّ اللَّهُ الْجَهْرَ بِالسُّوءِ مِنَ الْقَوْلِ إِلَّا مَنْ ظُلِمَ (۴/۱۴۸)۔ اللہ اسے بھی پسند نہیں کرتا کہ تم خواہ مخواہ کسی بات کی تشہیر کرتے پھرو۔ ہاں مگر جو مظلوم ہو اسے اس کی اجازت ہے کہ وہ اپنے ظلم کے مداوا کے لئے داد فریاد کرے۔

آپ نے غور فرمایا کہ قرآنِ کریم روزمرہ کی زندگی سے متعلق ان چھوٹی چھوٹی احتیاطی تدابیر سے، کس طرح ایسی خرابیوں کا ستو باب کر دیتا ہے، جو معاشرہ میں بہت بڑے فتنہ اور فساد کا موجب بن جاتی ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ اگر ہم، ان (بظاہر) معمولی سی تدابیر پر عمل کرنا شروع کر دیں تو معاشرہ میں کس قدر امن اور سکون پیدا ہو جائے! لیکن قرآن، ان چیزوں پر بھی محض میکانکی طور پر عمل نہیں کراتا۔ وہ افراد کے اندر ایسی نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جس سے یہ تمام باتیں ان کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس نے جماعتِ مومنین کے جنتی

دل کا شفاف ہونا

معاشرہ کے متعلق کہا ہے کہ وَنَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِمْ مِنْ غِلٍّ (۷/۴۳) ان کے دل میں کوئی ایسی بات نہیں رہے گی جسے وہ دوسروں سے چھپا کر رکھنا چاہیں۔
آپ غور کیجئے کہ وہ معاشرہ فی الواقعہ کس قدر جنتی ہو گا جس میں افرادِ معاشرہ کے دل اس قدر آئینے کی طرح صاف اور شفاف ہوں کہ ان میں غبار اور کدورت کا نشان تک نہ ہو اور ہر ایک کا ظاہر و باطن یکساں طور پر سب کے سامنے

ہو۔ اسی کو قرآن نے "دلوں میں باہمی اُلفت پیدا کرنے" سے تعبیر کیا ہے اور جماعتِ مومنین کو جس نعمتِ خداوندی کی یاد دلائی ہے وہ یہی باہمی اُلفت ہے۔ چنانچہ اس جماعت کو مخاطب کر کے کہا گیا وَاذْكُرُوْا نِعْمَتَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَاۤءً۔ تم خدا کی اس نعمتِ کبریٰ کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ۔ خدا نے تمہارے دلوں میں ایک دوسرے کی اُلفت ڈال دی۔ اُلفت، اس قسم کے تعلق کو

اُلفت اور اخوّت

کہتے ہیں جس میں ایک دوسرے کے دل یوں باہم گر مدغم ہو جائیں جس طرح بادل کا ایک ٹکڑا دوسرے ٹکڑے کے اندر ضم ہو جاتا ہے — تا کس نگوید بعد ازیں من دیگرم تو دیگرے — اس باہمی اُلفت کا نتیجہ یہ ہوا کہ فَاَصْبَحْتُمْ بِنِعْمَتِهٖۤ اِخْوَانًا۔ تم اس نوازشِ خداوندی سے ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے۔ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا۔ تم (اس سے پہلے) جہنم کے گڑھے کے کنارے پر پہنچ چکے تھے۔ بس اس میں گرنے ہی والے تھے کہ خدا نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ (۳/۱۰۳) اس طرح اللہ اپنے احکام کو واضح طور پر بیان کرتا ہے تاکہ تم جان لو کہ زندگی کا صحیح راستہ کون سا ہے۔ یہ "باہمی اُلفت" ایسی گراں بہا متاع اور نایاب جنس تھی، کہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا — کہ اگر تو چاہتا کہ ساری دُنیا کی دولت خرچ کر کے، ان کے دلوں میں ایسی اُلفت پیدا کر دے، تو بھی ایسا نہ ہو سکتا (۸/۶۳)۔ یہ متاع، باہر سے خرید کر دلوں میں داخل نہیں کی جا سکتی۔ یہ تو دلوں کے اندر تبدیلی سے پیدا ہوتی ہے۔ یعنی یہ نتیجہ ہوتی ہے قرآن کے ساتھ وابستگی کا۔ اسی لئے، اسے قائم رکھنے کے لئے فرمایا کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)۔ خدا کی اس رسّی کو سب

اعتصام بحبل اللہ

مل کر مضبوطی سے تھامے رہو اور تفرقہ مت پیدا کرو۔ یہی وہ رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے کے بعد کہا کہ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ اِخْوَةٌ (۴۹/۱۰)۔ مومن ایک دوسرے کے بھائی بھائی ہیں۔ بھائی بھی ایسے جن کی کیفیت یہ ہے کہ رُحَمَاۤءُ بَيْنَهُمْ (۴۸/۲۹)۔ آپس میں ایک دوسرے کے ہمدرد اور غمگسار۔ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ (۵/۵۴)۔ ایک دوسرے کے سامنے جھکے ہوئے — ہو حلقۂ یاراں تو بریشم کی طرح نرم — لیکن اس نرمی کے یہ معنی نہیں کہ کوئی غلط کام کرے تو اُسے روکا ٹوکا

بُرائی سے روکو

بھی نہ جائے۔ قرآن کریم نے یہودیوں کی تباہی کی ایک وجہ یہ بھی بیان کی ہے کہ كَانُوْا لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ (۵/۷۹) وہ ایک دوسرے کو بُری باتوں سے روکتے نہیں تھے۔ جب جماعتِ مومنین کا عام فریضہ، امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے (۳/۱۰۴، ۱۱۰، ۹/۷۱)۔ یعنی لوگوں کو ان باتوں کے کرنے کا حکم دینا جنہیں قرآن نے اچھا قرار دیا ہے اور ان امور سے روکنا جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے تو اس کے یہ معنی تھوڑے ہیں کہ یہ جماعت، دوسروں کو تو ایسا کہے گی لیکن خود اپنے معاشرے میں یہ کچھ نہیں کرے گی؟ وہ تو سب سے پہلے، ان امور کو خود اپنے ہاں عام کرے گی اور اس کے بعد انہیں دوسروں تک پھیلائے گی۔ اسی لئے جماعتِ مومنین کی خصوصیت یہ بتائی کہ وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ (۱۰۳/۳)۔ وہ ایک دوسرے کو حق (قرآنی احکام وقوانین) کے ساتھ تمسک اور استقامت پذیر رہنے کی تلقین کرتے ہیں۔ اور اس طرح باہمی اصلاح کرتے رہتے ہیں — اس لئے کہ وَاَصْلِحُوْا ذَاتَ بَيْنِكُمْ (۸/۱) ان کے خدا کا

باہمی صلح کراؤ

ارشاد ہے اور یہ بھی ارشاد ہے کہ اگر سوءِ اتفاق سے ان کی دو جماعتوں میں کہیں لڑائی جھگڑا ہو جائے تو فَاَصْلِحُوْا بَیْنَهُمَا (۴۹/۹)۔ ان میں باہمی صلح کراؤ۔ اور اگر ان میں سے کوئی پارٹی سرکشی پہ اتر آئے تو اُسے اس سے بزور روکو۔ اور جب وہ اپنی اس روش سے باز آجائے تو ان دونوں میں عدل و انصاف کے مطابق صلح کرا دو۔

یہیں سے ہمارے سامنے، ایک اور اہم اصول آتا ہے اور وہ ہے توبہ۔ ایک شخص کا عام کردار اچھا ہے۔

توبہ کا مفہوم

لیکن کسی وقت اس سے نادانستہ کوئی غلط حرکت سرزد ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد اُسے اس کا احساس ہوتا ہے تو وہ اپنے کئے پہ نادم ہوتا ہے۔ اگر اس کی اس غلط حرکت سے کسی کو اذیت یا نقصان پہنچا ہے تو اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور آئندہ کے لئے اس کی پوری پوری احتیاط برتتا ہے کہ کبھی اس قسم کی حرکت سرزد نہ ہو۔ اسے قرآن نے تَابَ وَ اَصْلَحَ سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی جس مقام سے نادانستہ غلط قدم اٹھا تھا، اس مقام پر واپس آجانا اور اس کے بعد اپنی ایسی اصلاح کرنا کہ پھر ایسی غلطی نہ ہو۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا ہے، اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ حرکت، نادانستہ۔ غلطی، سہو اور خطا سے سرزد ہوئی ہو۔ عمداً ایسا نہ کیا ہو۔ چنانچہ قرآن کریم نے اس کی تصریح کر دی ہے کہ اِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللّٰهِ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السُّوْٓءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ یَتُوْبُوْنَ مِنْ قَرِیْبٍ فَاُولٰٓئِكَ یَتُوْبُ اللّٰهُ عَلَیْهِمْ (۴/۱۷)۔ توبہ اسی کی ہے جس سے کوئی غلطی نادانستہ سرزد ہو جائے اور اس کے بعد وہ فوراً اس کی تلافی کر دے۔ اس میں نادانستہ (بِجَهَالَةٍ) اور فوراً (مِنْ قَرِیْبٍ) کے الفاظ غور طلب ہیں۔ یہی چیز قرآن کریم نے دیگر مقامات پہ بھی بیان کی ہے مثلاً (۱۶/۱۱۹ میں)۔

عمداً جرائم

اس کے برعکس، ایک شخص دیدہ دانستہ، عمداً۔ ارادۃً۔ غلط حرکات کا ارتکاب کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔ دوسروں کے خلاف جھوٹے الزام لگاتا ہے۔ غیبت کرتا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔ اور جب وہ کہیں گھِر جاتا ہے۔ اپنی مدافعت کی کوئی شکل نہیں دیکھتا، تو کہہ دیتا ہے کہ مجھے معاف کر دو۔ تو اس کا نام توبہ نہیں۔ اس کے دیدہ و دانستہ ارتکاب نے یہ واضح کر دیا کہ یہ چیزیں اس کے کردار کا جزو بن چکی ہیں۔ یونہی نادانستہ سرزد نہیں ہوئیں۔ اس لئے، جب تک وہ اپنے کردار میں تبدیلی نہیں پیدا کرے گا، ان باتوں سے باز نہیں آسکے گا۔ وہ توبہ کرنے اور معافی مانگنے کے بعد بھی ایسا کچھ کرتا رہے گا۔ اسی لئے قرآن نے وضاحت سے کہہ دیا کہ وَلَیْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِیْنَ یَعْمَلُوْنَ السَّیِّاٰتِ حَتّٰٓی اِذَا حَضَرَ اَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ اِنِّیْ تُبْتُ الْـٰٔنَ (۴/۱۸)۔ توبہ ان لوگوں کی نہیں ہے جو بُری حرکات کرتے رہتے ہیں تا آنکہ جب ان کے سامنے موت آکھڑی ہوتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ میں توبہ کرتا ہوں — "موت کے سامنے آجانے" سے مفہوم یہ ہے کہ جب اُسے اس کا یقین ہو جائے کہ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ بے نقاب ہو جائے گا اور وہ اس کے مؤاخذہ سے بچ نہیں سکتا تو پھر معافی مانگنے لگ جائے۔ یہ منافقت ہے اور بدترین کردار کی علامت۔ یہی وجہ ہے کہ جب فرعون ڈوبنے لگا اور اس نے کہا کہ میں خدا پہ ایمان لاتا ہوں تو اس سے کہا گیا کہ اب ایمان سے کیا فائدہ؟ یہ بھی واضح ہے کہ ایسے شخص نے اپنی اس قسم کی

حرکات سے جس شخص کو اذیت یا نقصان پہنچا یا ہے، اگر وہ اسے معاف بھی کر دے تو اس سے اتنا ہی ہوگا کہ اُس سے کوئی انتقام نہیں لیا جائے گا۔ لیکن اُس کی اصلاح تو اُسی صورت میں ہو سکے گی جب وہ اپنے کردار میں خود تبدیلی پیدا کرے۔ یہی وہ حقیقت ہے جسے مغربی مفکر، نیٹشے نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ

> جو برائی تم نے میرے ساتھ کی ہے اسے تو میں معاف کر دوں گا۔ لیکن اس سے جو برائی تم نے خود اپنی ذات کے خلاف کی ہے، اسے کون معاف کر سکتا ہے ؟

اب آگے چلیے۔ مردِ مومن اپنے جوہرِ ذاتی، اور بلندیٔ سیرت و کردار کی بناء پر اپنے اندر وزن رکھتا ہے اور یہ وزن، ہر مقام پر اس کا توازن برقرار رکھتا ہے۔ لیکن جب انسان میں یہ خوبیاں نہ ہوں اور اس کا ایگو جھوٹی تسکین چاہے تو اس سے اس کے اندر نخوت اور پندار کے غلط جذبات ابھر آتے ہیں جس سے اس میں چھچھوراپن پیدا ہو جاتا ہے۔ قرآن کی تعلیم مردِ مومن میں یہ چیز پیدا نہیں ہونے دیتی۔ چھچھورے پن کا مظاہرہ انسان کی گفتار۔ چال ڈھال سے ہوتا ہے۔ اس لئے قرآن اس کی تاکید کرتا ہے کہ وَلَا تَمْشِ فِي الْأَرْضِ مَرَحًا (۱۷/۳۷)۔ زمین پر یوں ہی اکڑ کر نہ چلو۔ وَاقْصِدْ فِي مَشْيِكَ (۳۱/۱۹) اپنی رفتار میں میانہ روی اختیار کرو۔ اسی طرح وَاغْضُضْ مِن صَوْتِكَ (۳۱/۱۹)۔ اپنی آواز بھی نیچی رکھو۔ چلّا چلّا کر مت بولو۔ بیجا تکبر اور نخوت سے، لوگوں سے ترش روئی سے پیش نہ آؤ۔ وَلَا تُصَعِّرْ خَدَّكَ لِلنَّاسِ (۳۱/۱۸) اس لئے کہ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ مُخْتَالٍ فَخُورٍ (۳۱/۱۸)۔ خدا، خود پسند، شیخی خورے انسان کو پسند نہیں کرتا۔ یہ مومنین کی نشانی نہیں ہے۔

چھچھوراپن

نخوت و تکبر

مومن کی صفت یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں سے حسد نہیں کرتا۔ (۴/۵۴) بلکہ کوشش کرتا ہے کہ اس کے اپنے اندر زیادہ سے زیادہ خوبیاں پیدا ہوں اور اس باب میں وہ دوسروں سے آگے نکل جائے۔ اس لئے کہ اس کے خدا کا حکم ہے کہ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ (۲/۱۴۸)۔ بھلائی کی باتوں میں ایک دوسرے سے بڑھ جاؤ۔ ان کی یہ بھی خصوصیت ہے کہ هُمْ عَنِ اللَّغْوِ مُعْرِضُونَ (۲۳/۳)۔ وہ ہر قسم کے لغویات سے پرہیز کرتے ہیں، اور اگر کہیں اتفاق سے اس قسم کی باتیں ان کے سامنے آجائیں تو وہ ان سے دامن بچاتے ہوئے شریفانہ انداز سے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ وَإِذَا مَرُّوا بِاللَّغْوِ مَرُّوا كِرَامًا (۲۵/۷۲)۔ ان سے یہ بھی کہا گیا ہے کہ وَاجْتَنِبُوا قَوْلَ الزُّورِ (۲۲/۳۰)۔ ہر قسم کے مکر و فریب کی ملمع دار باتوں سے اجتناب کرو۔ قُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا (۳۳/۷۰)۔ ہمیشہ صاف سیدھی واضح محکم، دو ٹوک بات کرو۔ يَقُولُوا الَّتِي هِيَ أَحْسَنُ (۱۷/۵۳)۔ بڑے خوبصورت انداز سے اعتدال کے مطابق اچھی اچھی باتیں کرو۔ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ (۲/۴۲)۔ حق اور باطل۔ غلط اور صحیح۔ جھوٹ اور سچ کو آپس میں خلط ملط نہ کرو۔ وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ (۲/۴۲)۔ نہ ہی حق کو چھپاؤ۔

حسد نہیں

صاف۔ سیدھی بات کرو

عزۃ الاثم

انسان کے اندر ایک بدترین جذبہ ایسا ہے جو اس کی تمام خوبیوں کو تباہ کر دیتا ہے

اور اسے کبھی صحیح راستے کی طرف آنے نہیں دیتا یہ ہے اس کے ایگو کا جذبۂ پندار یعنی (FALSE PRESTIGE) کا احساس۔ اسے قرآن نے عِزَّۃٌ بِالْاِثْمِ کی جامع اصطلاح سے تعبیر کیا ہے۔ ایک شخص دل میں محسوس کرتا ہے کہ اس نے غلطی کی ہے لیکن اس کے ایگو کا جذبۂ پندار اسے اس کے اعتراف پر آمادہ نہیں ہونے دیتا۔ وہ اس کے لئے اعذار بارِدہ (JUSTIFICATORY REASONS) وضع کرتا ہے حالانکہ اس کا دل جانتا ہے کہ یہ دلائل جھوٹے اور یہ وجوہات وضعی ہیں۔ ایسے شخص پر سعادت کی راہیں کبھی نہیں کھل سکتیں۔ یہ چیز پارٹی بازی میں اکثر حق و صداقت کے راستے میں روک بن کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ اپنی پارٹی کا فرد صریحاً غلطی پر ہو، لیکن "پارٹی بازی" کا تقاضا ہے کہ آپ اس کی بہرحال تائید اور موافقت کریں۔ ایک ڈاکو ہر روز مسافروں کے گلے کاٹے اور غریبوں کو لوٹے۔ اس کی پارٹی کے دوسرے ڈاکو، اسے کبھی بُرا نہیں کہیں گے۔ لیکن اگر وہ لوٹ کے مال میں کچھ خورد برد کرے اور اس کی تقسیم منصفانہ نہ کرے، تو پھر پارٹی والے اسے بے ایمان اور بددیانت قرار دیں گے۔ پارٹی بازی میں یہی کچھ ہوتا ہے۔ اپنی پارٹی کا آدمی جب تک دوسروں کے خلاف کچھ کرتا رہے اسے کبھی نہیں ٹوکا جاتا بلکہ اس کی حوصلہ افزائی جاتی ہے۔ اس سے رفتہ رفتہ اس کے دل کی حالت یہ ہو جاتی ہے کہ اس میں کسی بات کو (ON MERIT) پر کھنے، اور عدل و انصاف کی رو سے فیصلہ کرنے کی صلاحیت باقی نہیں رہتی۔ یہ ہے وہ مسخ شدہ ذہنیت جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا ہے کہ وَاِذَا قِيۡلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتۡهُ الۡعِزَّةُ بِالۡاِثۡمِ۔ جب اس سے کہا جاتا ہے کہ قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کرو تو جھوٹی عزت کا احساس اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ فَحَسۡبُهٗ جَهَنَّمُ (۲/۲۰۶) نتیجہ اس کا یہ کہ اس کی انسانی صلاحیتیں جھلس کر راکھ کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔

مومن، نفس (ایگو) کے اس فریب میں نہیں آتا۔ یہ اس کے راستے میں کھڑا ہوتا ہے تو وہ دامن جھٹک کر آگے بڑھ جاتا ہے۔

پابندیٔ عہد

اب مومنین کی مثبت صفات کی طرف آئیے۔ ان کے متعلق سورۃ المومنون میں کہا گیا ہے کہ هُمۡ لِاَمٰنٰتِهِمۡ وَعَهۡدِهِمۡ رٰعُوۡنَ۔ یہ لوگ امانات کی حفاظت کرتے ہیں اور عہد کی پابندی۔ حفظِ امانت کے معنی یہی نہیں کہ جو چیز تمہارے پاس بطورِ امانت رکھی جائے اسے بحفاظت واپس کر دو۔ ہر وہ بات جسے کسی نے، تم پر بھروسہ کر کے تمہارے سپرد کی ہے وہ امانت میں داخل ہے۔ خواہ وہ اس کا کوئی راز ہو یا اس کی عزت و آبرو کی رکھوالی۔ جہاں تک عہد، معاہدہ کا تعلق ہے، اس کے معنی یہی نہیں کہ جو اقرار نامہ کسی کو لکھ کر دو اس پر قائم رہو۔ اس میں ہر قسم کا وعدہ بھی شامل ہے جو ایک انسان دوسرے سے کرتا ہے۔ یہ بڑی اہم صفت ہے۔ اور اس کی قرآن کریم نے بڑی شدت سے تاکید کی ہے۔ اَوۡفُوۡا بِالۡعُقُوۡدِ۔ میں ہر قسم کا عہد اور وعدہ آجاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ وعدہ کے معنی کیا ہیں۔ آپ کسی سے کہتے ہیں کہ "بھائی! اس وقت مجھے جانے دو۔ میں ٹھیک چار بجے آجاؤں گا۔" تو وہ آپ پر اعتماد کر کے آپ کی بات مان لیتا ہے۔ اگر آپ اپنے وعدے کے مطابق آتے نہیں تو آپ اپنا اعتماد کھو دیتے ہیں ـــــ اور یہ ظاہر ہے کہ دنیا میں بدترین قسم کا معاشرہ وہ ہوتا ہے جس میں کسی کو دوسرے پر اعتماد اور بھروسہ نہ ہو۔ ایسے معاشرہ میں ہر شخص عدمِ اطمینان

کے جہنم میں رہنا ہے۔ بعض لوگ تو دعدہ کرتے ہی منافقت سے ہیں۔ یعنی انہوں نے اسی وقت فیصلہ کر لیا ہوتا ہے کہ انہوں نے وعدہ پورا نہیں کرنا۔ لیکن اکثر جذباتی (یا IMPULSIVE) لوگ، شدتِ جذبات میں

جذباتی لوگ

آگے بڑھ کر ایک وعدہ کر لیتے ہیں اور اس کے بعد جب جذبات کی شدت ماند پڑ جاتی ہے تو اس وعدہ سے پھر جانے کی راہیں تلاش کرتے ہیں۔ اس سے جو نقصان دوسروں کو پہنچتا ہے اسے تو چھوڑیئے۔ خود ایسے لوگوں کی سوسائٹی میں کوئی عزت نہیں رہتی۔ مومن کی یہ حالت نہیں ہوتی۔ وہ وعدہ کرتا ہے تو سوچ سمجھ کر۔ اور جب وعدہ کر لیتا ہے تو پھر کچھ بھی کیوں نہ ہو۔ اُسے پورا کرتا ہے۔

بَلٰی مَنْ اَوْفٰی بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰی فَاِنَّ اللّٰهَ یُحِبُّ الْمُتَّقِیْنَ (۳/۷۶)۔ جو اپنے وعدے کو پورا کرتا ہے اور یوں قانونِ خداوندی کی پاسداری کرتا ہے۔ تو یہی لوگ ہیں جو خدا کے نزدیک پسندیدہ اطوار و کردار کے مالک ہوتے ہیں۔ لہٰذا، وعدہ شکنی، خواہ وہ شروع ہی میں بدنیتی کا نتیجہ ہو۔ یا بعد میں پھر جانے کی وجہ سے، اُس فرد کو ذلیل اور معاشرہ کو تباہ کر دیتی ہے۔ اسی لئے قرآن نے تاکیداً کہا ہے کہ اَوْفُوْا بِالْعَهْدِ۔ اِنَّ الْعَهْدَ کَانَ مَسْئُوْلًا (۱۷/۳۴) اپنے وعدہ کو ہمیشہ پورا کرو۔ اس کے متعلق تم سے پوچھا جائے گا۔ اور پُرسش تو اسی وقت شروع ہو جاتی ہے جب وعدہ خلافی کرنے والے کو ہر نگاہ حقارت اور نفرت سے دیکھنے لگتی ہے، خواہ وہ بظاہر کتنا ہی معتبر اور معزز کیوں نہ ہو۔

اب آگے بڑھئے۔ قرآنِ کریم نے مومنین کے متعلق کہا ہے کہ وہ قَآئِمًا بِالْقِسْطِ (۳/۱۸) ہوتے ہیں یعنی ہمیشہ انصاف پر ڈٹ کر کھڑے رہنے والے۔ عدل و انصاف وہ بنیاد ہے، جس پر انسانی سیرت کی

عدل کے علمبردار

عمارت استوار ہوتی ہے اس لئے قرآن کریم اس باب میں مومنین کے سامنے ایک بلند معیار رکھتا ہے جس پر پورا اترنے سے معاشرہ فی الواقعہ جنت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے ——— یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کُوْنُوْا قَوّٰمِیْنَ بِالْقِسْطِ ——— اے ایمان والو! دنیا میں عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو۔ اس باب میں کسی جذبے کو اپنے اوپر اثر انداز نہ ہونے دو۔ یہ کچھ خالصتہً لِلّٰہ کرو۔ اس مقصد کے لئے شہادت دینی پڑے تو نہ مدعی کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ نہ مدعا علیہ کی طرف سے۔ بلکہ شُهَدَآءَ لِلّٰهِ۔ تم خدا کی طرف سے گواہ بن کر جاؤ۔ اور سچی سچی گواہی دو۔ وَلَوْ عَلٰۤی اَنْفُسِكُمْ ——— خواہ وہ تمہارے اپنے ہی خلاف کیوں نہ جائے۔ اَوِ الْوَالِدَیْنِ ——— یا تمہارے والدین کے خلاف جائے۔ وَالْاَقْرَبِیْنَ ——— یا تمہارے دیگر رشتہ داروں کے خلاف ——— اِنْ یَّكُنْ غَنِیًّا اَوْ فَقِیْرًا ——— وہ دولت مند ہو یا غریب ہو، اس کا بھی تم پر کوئی اثر نہیں پڑنا چاہیئے۔ اس لئے کہ فَاللّٰهُ اَوْلٰی بِهِمَا ——— اللہ کا حق ان دونوں سے زیادہ ہے۔ اس لئے یاد رکھو۔ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰۤی اَنْ تَعْدِلُوْا۔ تم اپنے جذبات کے پیچھے مت چلو۔ اس باب میں، اپنے قلبی رجحانات کو اثر انداز مت ہونے دو۔ ایسا نہ ہو کہ تمہارے جذبات تمہیں عدل کرنے سے روک دیں۔ وَاِنْ تَلْوٗۤا۔ نہ ہی تم کوئی پیچدار۔ ذو معنی بات کرو۔ اَوْ تُعْرِضُوْا۔ نہ ہی اس سے اعراض برتو۔ پہلو تہی کرو۔ اس لئے کہ فَاِنَّ اللّٰهَ کَانَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ خَبِیْرًا (۴/۱۳۵)۔ جو کچھ تم کرتے ہو، خدا کو اس کی خبر ہوتی ہے۔ تم اس سے کچھ نہیں چھپا سکتے ——— یہ ہے عدل کا وہ معیار جو ایک مومن کے لئے مقرر کیا گیا

ہے۔ ذرا سوچئے کہ جو معاشرہ ایسے افراد پر مشتمل ہوگا جو اس صفت کے حامل ہوں، اس معاشرہ کی کیفیت کیا ہوگی۔ اس میں یہ نہیں ہوگا کہ اپنی پارٹی کا آدمی ہے تو اس کے لئے میزان اور ہوگی اور دوسری پارٹی کے آدمی کے لئے اور۔ سب اس میں، تو دشمن سے بھی عدل کیا جائے گا۔ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا (۵/۸)۔ دیکھنا! ایسا نہ ہو کہ کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ کر دے کہ تم اس کے ساتھ عدل نہ کرو۔ اُس سے بھی عدل کرو۔ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ (۵/۸)۔ تقویٰ سے قریب ترین روش یہی ہے۔

عدل کے سلسلہ میں اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کی ایک شکل وہ ہے جسے عدالتی عدل کہا جاتا ہے، یعنی لوگوں کے متنازعہ فیہ معاملات کا فیصلہ کرنا۔ اس کے متعلق قرآنِ کریم کا حکم ہے کہ إِذَا حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ (۴/۵۸)۔ جب تم لوگوں کے معاملات کا فیصلہ کرو، تو ہمیشہ عدل کے ساتھ فیصلہ

قانونِ عدل

کرو۔ عدالتی عدل کے معنی یہ ہیں کہ فیصلہ قانون کے مطابق ہو۔ لیکن قرآنِ کریم اس باب میں ایک قدم آگے جاتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اگر وہ قانون جس کے مطابق فیصلہ کیا جا رہا ہے، خود ہی عدل پر مبنی نہ ہو تو اس کی رُو سے کیا ہوا فیصلہ کس طرح مبنی بر عدل کہلا سکے گا؟ لہٰذا جماعتِ مومنین کے متعلق قرآنِ کریم میں ہے أُمَّةٌ يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ (۷/۱۸۱)۔ یہ جماعت "الحق" کے مطابق لوگوں کی راہ نمائی کرتی ہے اور اسی (الحق) کے ساتھ عدل کرتی ہے۔ یعنی ان کے قوانین الحق پر مبنی ہوتے ہیں۔ اور انہی قوانین کے مطابق یہ لوگوں کے فیصلے کرتے ہیں۔ اور یہ ظاہر ہے کہ الحق قرآنِ کریم ہے کیونکہ خود خدا کا ارشاد ہے کہ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَا أَنزَلَ اللَّهُ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ (۵/۴۴)۔ جو لوگ معاملات کے فیصلے قرآن کے مطابق نہیں کرتے، سو وہی کافر ہیں۔

عدل کی دوسری شکل یہ ہے کہ ہر شخص کو اس کا واجب حق ادا کر دیا جائے۔ اس میں کسی قسم کی کمی نہ کی جائے۔ یہ وہ عدل ہے جو ہر شخص کی زندگی میں قدم قدم پر سامنے آتا ہے اور مومن اس میں ہر مقام پر پورا اترتا ہے۔ آپ

واجبِ حق

سوچئے کہ جس معاشرہ میں ہر شخص کو اس کا حق، بلا کد و کاوش اور بلا پریشانی و تشویش مل جایا جائے۔ اس میں زندگی کس قدر خوشگوار گزرے گی۔ اس سلسلہ میں قرآنِ کریم نے ایسے جامع الفاظ استعمال کئے ہیں جنہیں پھیلانے سے زندگی کا ہر گوشہ اس کے دائرے کے اندر آجاتا ہے۔ اس نے کہا ہے: وَأَوْفُوا الْكَيْلَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ (۶/۱۵۳)۔ "ماپ اور تول کو عدل و انصاف کے ساتھ پورا کرو۔" ماپ اور تول میں ہر قسم کے واجبات آجاتے ہیں۔

لیکن قرآنِ کریم عدل سے بھی ایک قدم آگے بڑھتا ہے اور اس کے ساتھ احسان کا حکم دیتا ہے۔ جیسا کہ اُوپر بتایا گیا ہے، عدل کے معنی ہیں جو کچھ کسی کا واجب ہے وہ ادا کر دینا۔ لیکن اگر اس سے دوسرے کی ضرورت پوری نہ

احسان

ہوتی ہو تو قرآن کی تاکید یہ ہے کہ اسے اس کے واجب سے زیادہ دے کر اس کی کمی کو پورا کر دیا جائے۔ اسے احسان کہتے ہیں جس کے معنی ہیں کسی کے بگڑتے ہوئے توازن کو برقرار کر دینا اور اس طرح معاشرہ میں حسن پیدا کر دینا۔ اس "احسان" کی ابتداء اپنے گرد و پیش سے کی جائے گی اور اس میں سرِ فہرست والدین کا نام آئے گا۔ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا (۴/۳۶)۔ آپ حیوانات پر غور کیجئے۔ آپ دیکھیں

لگے کہ وہاں، ماں باپ اپنے بچے کی پرورش تو کرتے ہیں لیکن بچے اپنے والدین کو پوچھتے تک نہیں۔ وہ انہیں

والدین سے احسان

جانتے پہچانتے بھی نہیں۔ یہ خصوصیت انسانی زندگی میں آکر پیدا ہوتی ہے کہ جب ماں باپ بوڑھے ہو جائیں تو اولاد ان کی خبرگیری کرے۔ والدین کے بعد دوسرے لوگ بھی اسی زمرے میں شامل ہوتے چلے جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہے وَبِذِي الْقُرْبَىٰ - وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ یہی احسان دیگر اقرباء سے بھی کرو۔ اور ان لوگوں سے بھی جو معاشرہ میں کسی وجہ سے تنہا رہ گئے ہوں۔ یا جو حرکت کے قابل نہ رہیں اور ان کا چلتا ہوا کاروبار رُک جائے۔ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبَىٰ - وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنبِ وَابْنِ السَّبِيلِ۔ نیز ہمسایہ سے بھی، خواہ وہ قریب کا ہو یا دور کا۔ اپنوں میں سے ہو یا بیگانوں میں سے۔ نیز اپنے رفقائے کار کے ساتھ بھی۔ اور ان مسافروں کے ساتھ بھی جن کے پاس زادِ راہ نہ رہا ہو، یا وہ ویسے ہی تمہارے حسنِ سلوک کے متمنی ہوں۔ وَمَا مَلَكَتْ أَيْمَانُكُمْ (۴/۳۶)۔ اور ان لوگوں کے ساتھ بھی جو تمہارے ماتحت کام کریں۔ ان سب کے ساتھ عدل کرو۔ ان کے حق میں کسی قسم کی کمی نہ کرو۔ اور اگر اس کے باوجود، ان میں کوئی کمی رہ جائے تو اس کمی کو بھی پورا کر دو۔ اور اس کا دل میں خیال تک بھی نہ لاؤ کہ تم نے ان پر کوئی احسان کیا ہے، چہ جائیکہ اس احسان کی وجہ سے تم ان پر بارِ گراں بن جاؤ۔ اور انہیں خواہ مخواہ قلبی اور ذہنی اذیت پہنچاتے رہو۔ اس لئے کہ مومنین کا شعار یہ ہے کہ لَا يُتْبِعُونَ مَا أَنفَقُوا مَنًّا وَلَا أَذًى (۲/۲۶۲)۔ وہ کسی کو کچھ دے کر اس کے سر پر سوار نہیں ہو جاتے۔ سر پر سوار ہونا تو ایک طرف، وہ ان سے کہہ دیتے ہیں کہ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (۷۶/۹) ہم تم سے، اس کا بدلہ تو ایک طرف، شکریہ تک کے بھی خواہاں نہیں ہیں۔ اس لئے کہ هَلْ جَزَاءُ الْإِحْسَانِ إِلَّا الْإِحْسَانُ (۵۵/۶۰)۔ اس کمی کی وجہ سے تمہارا توازن بگڑ رہا تھا۔ ہم نے اس توازن کو برقرار کر دیا۔ بس یہی اس کا بدلہ ہے۔ دوسروں کی کمی پورا کرنے کے سلسلہ میں وہ اس قدر آگے بڑھ جاتے ہیں کہ يُؤْثِرُونَ عَلَىٰ أَنفُسِهِمْ وَلَوْ كَانَ بِهِمْ خَصَاصَةٌ (۵۹/۹)۔ وہ خود تنگی میں گزارہ کر لیتے ہیں اور دوسروں کی ضرورت کو اپنی ضرورت پر ترجیح دیتے ہیں۔

مقروض سے نرمی

یہ تو احسان کی صورت ہے جس میں کچھ واپس لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ وہ اگر کسی کو قرض دیتے ہیں اور دیکھتے ہیں کہ مقروض کی حالت سقیم ہے تو اس پر سختی نہیں کرتے بلکہ اُسے اس وقت تک کی مہلت دیتے ہیں جب تک وہ آسانی سے قرض ادا کر دینے کے قابل نہ ہو جائے۔ اور اگر ایسا ہو کہ وہ قرضہ ادا کرنے کے قابل ہی نہیں رہا تو قرض معاف کر دیتے ہیں۔ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ ۚ وَأَن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ (۲/۲۸۰)۔

ناحق مال نہ کھاؤ

ظاہر ہے کہ جن لوگوں کی یہ خصوصیات ہوں وہ کسی کا مال ناحق کس طرح کھا جائیں گے اور جائز اور ناجائز کی تمیز کو کس طرح مٹا دیں گے؟ انہیں اس کی تاکید کی گئی ہے کہ وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ وَتُدْلُوا بِهَا إِلَى الْحُكَّامِ لِتَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ (۲/۱۸۸)۔ آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طریق سے مت کھاؤ۔ یا اگر معاملہ عدالت

ایک مسلمان کو بھی بالارادہ قتل کر دیا اس کا ٹھکانہ جہنم ہے؟ بعد میں آنے والوں نے یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیا کہ جب صحابہ کبارؓ اس آیت کی موجودگی میں، ایک دوسرے کو قتل کرتے رہے اور بدستور رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے مستحق ٹھہرائے گئے، تو اگر ہم بھی، انہی کے اتباع میں، ایک دوسرے کی گردن مار دیں تو کونسا جرم ہو گیا؟ اور پھر اس سازش کی انتہا ملاحظہ ہو کہ جو شخص یہ کہہ دے کہ اس قسم کے واقعات، وضعی افسانے ہیں جنہیں بعد میں مفاد کے تحت ہماری تاریخ میں شامل کر دیا گیا ہے، تو اس پر کفر کے فتوے لگا دیئے جاتے ہیں۔ جنہوں نے پہلے ایسا کہا تھا ان پر بھی کفر کے فتوے لگائے گئے تھے۔ جو آج ایسا کہتے ہیں ان پر بھی کفر کے فتوے لگتے ہیں۔ ایسا کرنے والے قرآن مجید کی اس آیت کو بھی مانتے ہیں جس کا ذکر پہلے کیا جا چکا ہے اور اسے بھی صحیح تسلیم کرتے ہیں کہ ان مسلمانوں نے (جن کو مومن حقا ہونے کی شہادت اور مستحق جنت ہونے کی بشارت خود خدا نے دی تھی)۔ لاکھوں کی تعداد میں ایک دوسرے کو قتل کیا تھا۔ اسے کہتے ہیں کامیاب سازش!

تاریخ کو چھوڑیئے۔ آپ سوچیئے کہ جو مسلمان قومیں آج جنگ کے میدانوں میں ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہی ہیں، کیا ان کے متعلق کہا جائے گا کہ ان کا قرآن مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟ (ضمناً) وہ مسلمان قومیں جو خود تو شریکِ جنگ نہیں، لیکن ان لڑنے والوں کا تماشا دیکھ رہی ہیں۔ وہ بھی یہ کہہ کر اپنے آپ کو فریب دے لیتی ہیں کہ ہمارا قرآن پر ایمان ہے۔ ہم قتال کے جرم کی مرتکب نہیں۔ ان کے متعلق بھی قرآن کریم میں ایک ارشاد موجود ہے اور وہ یہ کہ

وَإِن طَائِفَتَانِ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ اقْتَتَلُوا فَأَصْلِحُوا بَيْنَهُمَا (۴۹/۹)

اگر مسلمانوں کے کوئی دو گروہ باہم دگر نبرد آزما ہو جائیں تو تمہارا فریضہ ہے کہ تم آگے بڑھ کر ان میں صلح کرا دو۔

جو مسلمان قومیں، مشرقِ وسطیٰ کے اس زلزلے میں، مسلمانوں کے ہاتھوں دوسرے مسلمانوں کے قتل کو خاموش بیٹھے دیکھ رہی ہیں، انہیں سوچنا چاہیئے کہ کیا ان کا قرآن مجید کی اس آیت پر ایمان ہے؟

عزیزانِ من! میں نے یہ مثالیں صرف یہ بتانے کے لئے پیش کی ہیں کہ یہ کہہ دینا کہ ہمارا قرآن کریم پر ایمان ہے اور عملاً اس کے خلاف چلنا، قرآن پر ایمان نہیں کہلا سکتا۔ لہٰذا آج، اقتدارِ خداوندی کو پسِ پشت ڈال کر محض روٹی کے مسئلہ کو مقصودِ حیات قرار دینے والی مسلمان مملکتیں بھی اسی طوفان میں بہے جا رہی ہیں جس میں دنیا کی غیر مسلم اقوام وقفِ تلاطم ہیں۔ یہی سبب ہے کہ وہ اور ہم سب اس جہنم کے عذاب میں گرفتار ہیں جسے قرآن کریم نے اس منہجِ زندگی کا فطری نتیجہ قرار دیا تھا۔ جب تک ہم اقتدارِ خداوندی کی اہمیت کو سرِ فہرست نہیں رکھتے، معاشرہ کی جن تباہ کن خرابیوں کا ہم رونا روتے رہتے ہیں، ان میں کوئی اصلاح نہیں ہو سکتی۔ حج جی میں

تک پہنچ چکا ہے تو ایسا نہ کرو کہ حکام کو رشوت دے کر ایسا فیصلہ کرالو جس سے دوسروں کا کچھ مال ناجائز طور پر تمہیں مل جائے حالانکہ تم جانتے ہو کہ جو مال اس طرح حاصل کیا جائے اس کا نتیجہ کیا ہوتا ہے۔

☆

یہاں تک ضبطِ نفس کی ان حدود کا ذکر آیا ہے جن کا تعلق مال و دولت سے ہے۔ اس کے بعد جنسی جذبات

حفاظتِ عصمت

میں ضبط و تحدید کی صورت سامنے آتی ہے۔ اس باب میں مومن انتہائی پاکبازی کا مظہر ہوتے ہیں۔ هُمْ لِفُرُوْجِهِمْ حٰفِظُوْنَ (۲۳/۵)۔ وہ اپنی عصمت کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں عصمت و عفت کا لفظ صرف عورت کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ لیکن قرآن کریم اس باب میں، مرد اور عورت میں کوئی فرق نہیں کرتا۔ وہ مردوں سے بھی اسی طرح عصمت کا مطالبہ کرتا ہے جس طرح عورتوں سے۔ وہ کہتا ہے کہ مومنین، زنا تو خیر بہت دور کی بات ہے۔ فواحش (یعنی عام بے حیائی کی باتوں) کے بھی قریب تک نہیں پھٹکتے، خواہ وہ کھلی ہوئی بے حیائی ہو یا پوشیدہ۔ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ۔ (۶/۱۵۲)۔ خود بھی بچتے ہیں اور اس قسم کی تدابیر اختیار کرتے ہیں جن سے اس قسم کی باتیں معاشرہ میں پھیلنے نہ پائیں (۲۴/۱۹)۔ وہ اپنی نگاہوں کو کبھی بے باک نہیں ہونے دیتے کیونکہ ان سے کہا گیا ہے کہ يَغُضُّوْا مِنْ اَبْصَارِهِمْ (۲۴/۳۰) اپنی نگاہوں کو بے باک مت ہونے دو۔ وہ جنسی بے راہ روی کے خیال تک کو اپنے دل میں نہیں آنے دیتے، اس لئے کہ ان کا ایمان ہے کہ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹)۔ خدا، نگاہ کی خیانت اور دل میں پوشیدہ خیالات تک سے واقف ہے۔

علاوہ بریں، عام جذبات میں بھی ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ وہ انہیں کبھی بدلگام اور حدود فراموش

خیالات کی پاکیزگی

نہیں ہونے دیتے۔ اگر کبھی ان میں شدت پیدا بھی ہو تو وہ (تخریب کی بجائے) ان کا رُخ تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دیتے ہیں۔ اسی لئے مومنین کی خصوصیت كَاظِمِيْنَ الْغَيْظَ (۳/۱۳۳)۔ بتائی گئی ہے۔ اس کے معنی "غصے کو دبا لینے والے" نہیں۔ اس کے معنی ہیں، اس زائد قوت کو تعمیری کاموں کی طرف منتقل کر دینے والے۔ اس کے بعد ہے وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ (۳/۱۳۳)۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے مقامات پر یہ نہیں دیکھتے کہ دوسرے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کرتے ہیں (تاکہ وہ بھی ویسا ہی برتاؤ ان کے ساتھ کریں)۔ وہ ان کے برتاؤ سے قطع نظر کر کے، دیکھتے یہ ہیں کہ انہیں قوانینِ خداوندی کے مطابق کیا کرنا چاہیئے۔ ان کے جذبات کبھی سرکشی اختیار نہیں کرتے۔

جذبات پر قابو

وہ انہیں ہمیشہ اپنے کنٹرول میں رکھتے ہیں۔ اسی حقیقت کو قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ شیطان ان پر کبھی غلبہ نہیں پا سکتا۔ اِنَّ عِبَادِيْ لَيْسَ لَكَ عَلَيْهِمْ سُلْطٰنٌ (۱۵/۴۲)۔ حتیٰ کہ اگر کبھی اس قسم کا کوئی خیال یونہی گھومتے پھرتے ان کے دل میں آجائے تو وہ فوراً قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے لے آتے ہیں۔ اور اس سے یوں ہوتا ہے گویا ایک دم روشنی ان کے سامنے آگئی اور انہوں نے صحیح راستہ اختیار کر لیا۔ اِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ تَذَكَّرُوْا فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ (۷/۲۰۱)۔ زندگی کے ہر شعبے میں، قانونِ خداوندی کو اپنے سامنے رکھنا، یہ ہے وہ سب سے بڑی قوت جس سے مومنین، غلط باتوں کے ارتکاب سے مجتنب رہتے ہیں۔ اس کو ذکر اللہ کہتے ہیں۔ ان قوانین کی

خلاف ورزی سے جو تباہیاں آتی ہیں، ان کا احساس انہیں کپکپا دیتا ہے۔ إِنَّمَا الْمُؤْمِنُونَ الَّذِينَ إِذَا ذُكِرَ اللَّهُ وَجِلَتْ قُلُوبُهُمْ مومنین کی خصوصیت یہ ہے کہ جب قوانینِ خداوندی کا مجموعی تصور ان کے سامنے آتا ہے تو ان کی خلاف ورزی سے جو تباہی آتی ہے اس کے احساس سے ان کا دل کانپ اٹھتا ہے۔ وَإِذَا تُلِيَتْ عَلَيْهِمْ آيَاتُهُ زَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَعَلَىٰ رَبِّهِمْ يَتَوَكَّلُونَ (۸/۲)۔ اور جب ان قوانین کی تفاصیل ان کے سامنے آتی ہیں تو ان پر عمل پیرا ہونے کے خوشگوار نتائج کے تصور سے ان کا ایمان بڑھ جاتا ہے۔ اور وہ ان قوانین کی محکمیت پر پورا پورا اعتماد رکھتے ہیں۔ اور یہی وہ، قوانینِ خداوندی پر اعتمادِ کلی اور یقینِ کامل ہے جس سے انہیں استقامت حاصل ہوتی ہے اور ان کے پاؤں میں کبھی لغزش نہیں آتی۔ اسی لئے انہیں الصَّابِرِينَ۔ وَالصَّادِقِينَ وَالْقَانِتِينَ (۳/۱۷)۔ کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یعنی مستقل مزاج۔ مصارفِ زندگی میں جم کر کھڑے ہونے والے۔ اپنے دعویٰ ایمان کو اپنے اعمال سے سچ کر دکھانے والے۔ اور قوانین خداوندی کا پورا پورا اتباع کرنے والے۔ اپنی تمام توانائیوں کو ان کے مطابق صرف کرنے والے۔

خشیتِ قلبی

جذبات کو کنٹرول میں رکھنے کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ لوگ کبھی عقل و فکر سے عاری نہیں ہوتے۔ اپنا دماغی توازن کبھی نہیں کھوتے۔ ہر معاملہ پر نہایت ٹھنڈے دل سے غور و فکر کرکے صحیح نتیجے پر پہنچتے ہیں۔ اسی لئے قرآن نے انہیں أُولُو الْأَلْبَابِ (۳/۱۹۰)۔ کہہ کر پکارا ہے۔ یعنی وہ صاحبانِ عقل و بصیرت يَتَفَكَّرُونَ فِي خَلْقِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ جو کائنات کی تخلیق پہ غور و فکر کے بعد اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ رَبَّنَا مَا خَلَقْتَ هَٰذَا بَاطِلًا (۳/۱۹۰)۔ اے ہمارے نشو و نما دینے والے! تو نے اس عظیم کارگہِ کائنات کو بے مقصد پیدا نہیں کیا۔ ان کے عقل و فکر سے کام لینے کی کیفیت یہ ہے کہ إِذَا ذُكِّرُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ لَمْ يَخِرُّوا عَلَيْهَا صُمًّا وَعُمْيَانًا (۲۵/۷۳)۔ اور تو اور، جب ان کے سامنے ان کے رب کے احکام و قوانین پیش کئے جاتے ہیں تو وہ ان پر بھی بہرے اور اندھے بن کر نہیں گر پڑتے۔ انہیں غور و فکر سے قبول کرتے، اور علم و بصیرت کی رُو سے ان پر عمل کرتے ہیں۔ اس طرح وحیِ خداوندی پر ایمان لاتے ہیں اور پھر اپنے جذبات کو اس وحی کے تابع رکھتے ہیں، کیونکہ قرآن کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوَاهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللَّهِ (۲۸/۵۰)۔ "اس سے بڑھ کر راہ گم کردہ اور کون ہو سکتا ہے جو خدا کی راہ نمائی کے بغیر اپنے جذبات کا اتباع کرتا ہے" — یوں، وحیِ خداوندی، علم و عقل اور جذبات کے حسین امتزاج سے، مردِ مومن کا قالب تیار ہوتا ہے۔

صاحبانِ عقل و بصیرت

اقبالؒ کے الفاظ میں

بتاؤں تجھ کو مسلماں کی زندگی کیا ہے　　یہ ہے نہایت اندیشہ و کمالِ جنوں
عناصر اس کے ہیں رُوح القدس کا ذوقِ جمال　　عجم کا حسنِ طبیعت عرب کا سوزِ دروں

اور ظاہر ہے کہ جب مومنین خود کسی بات کو سوچے سمجھے بغیر نہ قبول کرتے ہیں نہ تسلیم، تو وہ دوسروں سے اپنی بات کس طرح دھاندلی سے منوا سکتے ہیں۔ وہ اپنے ہر دعوے کو دلیل و برہان کی رو سے پیش کرتے اور علم و

بصیرت کی رُو سے منواتے ہیں۔ چنانچہ نبی اکرمؐ سے کہا گیا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ عَلٰى بَصِيْرَةٍ

دلائل وبراہین

اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِیْ (۱۰۸/۱۲) میں تمہیں جو خدا کی طرف دعوت دیتا ہوں تو علیٰ وجہ البصیرت ایسا کرتا ہوں۔ میں بھی یہی کرتا ہوں اور میرے متبعین بھی ایسا ہی کریں گے۔ ہماری دعوت علم وبصیرت پر مبنی ہوگی۔ اسی لئے جماعتِ مؤمنین سے تاکید کی گئی کہ اُدْعُ اِلٰى سَبِيْلِ رَبِّكَ بِالْحِكْمَةِ وَالْمَوْعِظَةِ الْحَسَنَةِ وَجَادِلْهُمْ بِالَّتِیْ هِیَ اَحْسَنُ (۱۲۵/۱۶)۔ تم لوگوں کو، اپنے رب کے راستے کی طرف اس انداز سے دعوت دو کہ ان کے دل اور دماغ دونوں کی تسکین ہو جائے۔ وہ اسے ذہن اور قلب کی پوری رضامندی کے ساتھ مانیں۔ اور جو اعتراضات وہ پیش کریں ان کا جواب نہایت حسن کارانہ انداز سے دو۔ یوں ہی اندھا دھند مت جھگڑتے چلے جاؤ۔ فرعون جیسے سرکش اور متکبر کو بھی پہلے نرمی اور آشتی سے سمجھانے کی کوشش کرو۔ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّيِّنًا لَّعَلَّهٗ يَتَذَكَّرُ اَوْ يَخْشٰى (۴۴/۲۰)۔ ہو سکتا ہے کہ اس طرح بات اس کی سمجھ میں آجائے اور وہ اپنی سرکشی کے تباہ کن نتائج سے ڈر جائے۔ لیکن اگر واسطہ ایسے لوگوں سے پڑ جائے جو اپنی ضد اور جہالت پر اڑے رہنا چاہیں اور کسی بات پر دھیان دینے کی کوشش ہی نہ کریں، تو ان سے اعراض برتو۔ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ (۱۹۹/۷)۔ لیکن اس کے باوجود ایسے موقعہ کی تلاش میں رہو کہ وہ بات سننے پر آمادہ ہوں تو ان تک پھر خدا کا پیغام پہنچاؤ۔ وَذَكِّرْ بِهٖٓ اَنْ تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ (۷۰/۶)۔ تاکہ وہ اپنی غلط روی کے باعث قرآن کی راہ نمائی سے محروم نہ رہنے پائیں۔

اپنی اصلاح

لیکن دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے ضروری ہے کہ کہنے والا خود اپنی اصلاح کرے۔ جماعتِ مومنین کا یہی شیوہ ہوتا ہے۔ وہ پہلے خود عمل کرتے ہیں اور پھر دوسروں کو اس کی دعوت دیتے ہیں۔ اس لئے قرآن میں خدا کا ارشاد ہے کہ لِمَ تَقُوْلُوْنَ مَا لَا تَفْعَلُوْنَ۔ كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ (۶۱/۲-۳)۔ تم وہ بات کیوں کہتے ہو جسے خود کر کے نہیں دکھاتے۔ اللہ کے نزدیک یہ انداز بڑا ناپسندیدہ ہے کہ تمہارے قول اور فعل میں تضاد ہو۔ ایسی نصیحت جس پر انسان خود عمل نہ کرے، محض شاعری بن کر رہ جاتی ہے۔

شاعری مت کرو

اور اس قسم کی روش مومن کا شعارِ زندگی نہیں ہو سکتی۔ اس لئے قرآن میں آیا ہے کہ وَمَا عَلَّمْنٰهُ الشِّعْرَ وَمَا يَنْۢبَغِیْ لَهٗ (۶۹/۳۶)۔ ہم نے اپنے رسول کو شاعری نہیں سکھائی۔ شاعری اس کے شایانِ شان ہی نہ تھی۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے شاعر اور مومن کو ایک دوسرے کی ضد بنایا ہے۔ چنانچہ سورۂ شعراء میں، شاعروں کی یہ خصوصیات بتائی ہیں کہ وہ اپنے تصورات کی دنیا میں مارے مارے پھرتے ہیں۔ کبھی اس وادی میں۔ کبھی اُس بیابان میں۔ ایک ایسے اونٹ کی طرح جسے جھوٹی پیاس اِدھر اُدھر لئے پھرے۔ اور ان کی ساری عمر باتیں کرنے میں گزر جاتی ہے اور وہ عمل کے قریب تک نہیں پھٹکتے۔ ان خصوصیات کا ذکر کرنے کے بعد کہا اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ (۲۲۷/۲۶)۔ لیکن مومنین اس قسم کے نہیں ہوتے وہ ابدی صداقتوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کے مطابق کام کر کے دکھاتے ہیں۔ واضح رہے کہ قرآنِ کریم نے جب شاعری کی مذمت کی ہے تو اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص اپنی بات کلامِ موزوں میں پیش کرے تو وہ قابلِ مذمت ہے اور اگر وہ اُسے نثر میں بیان کرے تو قرآن کی رُو سے مستحسن۔ بات نثر اور نظم کی نہیں

بات اس ذہنیت کی ہے جسے قرآن نے "شاعری" سے تعبیر کیا ہے۔ اس ذہنیت کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے سامنے زندگی کا کوئی متعین مقصد اور نصب العین نہ ہو۔ وہ اپنے جذبات کی رو میں جو جی میں آئے کہتا چلا جائے اور جو کچھ کہے اس میں بھی تصنع اور بناوٹ ہو۔ اور دوسرے یہ کہ وہ ساری عمر باتیں کرتا رہے ان پر عمل کبھی نہ کرے۔ ذہنیت اس کی یہ ہو اور وہ اُسے نوائے سروش سے تعبیر کر کے اپنے آپ کو صاحبِ وجدان قرار دے۔ یہ ہے وہ ذہنیت جسے مومن کی ذہنیت کی ضد قرار دیا گیا ہے۔ خواہ اس ذہنیت کا حامل، نثر میں بات کرے یا نظم میں۔ مومن کے سامنے ایک متعین نصب العین حیات ہوتا ہے۔ اور وہ جو کچھ کہتا ہے اس پر عمل بھی کرتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ چھوٹی موٹی لغزشیں مومنین سے بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ معصوم عن الخطاء نہیں ہوتے۔ لیکن یہ لغزشیں ان سے سہو وخطا کی بناء پر نادانستہ سرزد ہوتی ہیں جن سے وہ فوراً تائب ہو جاتے ہیں۔ وہ بنیادی

چھوٹی موٹی لغزشیں

غلط روی سے، جسے قرآن نے کبائر سے تعبیر کیا ہے، ہمیشہ مجتنب رہتے ہیں۔ اَلَّذِيْنَ يَجْتَنِبُوْنَ كَبٰٓئِرَ الْاِثْمِ وَالْفَوَاحِشَ اِلَّا اللَّمَمَ (۵۳/۳۲)۔ مومن وہ ہیں جو بنیادی غلط کاریوں اور بے حیائی کی باتوں سے ہمیشہ بچتے ہیں۔ ہاں! یہ ہو سکتا ہے کہ ان سے کبھی کبھار نادانستہ کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہو جائے۔ لہٰذا مومن کا انداز یہ ہے کہ وہ جس بات کی دوسروں کو نصیحت کرتا ہے اس پر پہلے خود عمل کرتا ہے۔

لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ اگر کوئی شخص کسی کو اس کی غلطی پر ٹوکے تو وہ اسے یہ کہہ کر جھٹک دے کہ میاں! پہلے اپنی اصلاح تو کرو۔ پھر دوسروں سے کہنا ــــ نہیں! مومن کا یہ شعار نہیں۔ وہ کہنے والے کی بات کو توجہ سے سنتا ہے۔ پھر اپنا جائزہ لیتا ہے اور اگر دیکھتا ہے کہ اس میں واقعی وہ کمزوری موجود ہے تو اس کی اصلاح کر

اعتراض کی بجائے اصلاح

لیتا ہے اس لئے کہ وہ اس اصول کو پیشِ نظر رکھتا ہے جسے قرآن نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے کہ عَلَيْكُمْ اَنْفُسَكُمْ ۔ لَا يَضُرُّكُمْ مَّنْ ضَلَّ اِذَا اهْتَدَيْتُمْ (۵/۱۰۵) "تم اپنی اصلاح کی فکر کرو۔ اگر تم صحیح راستے پر جا رہے ہو، تو غلط راستے پر چلنے والا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا"۔ اس لئے جو شخص تمہاری غلط روی پر ٹوکتا ہے اس کی بات سننے سے یہ کہہ کر انکار نہ کر دو کہ جب تم خود اس پر عمل نہیں کرتے تو تمہیں دوسروں کو نصیحت کرنے کا کیا حق ہے؟ تمہیں تمہاری غلط روی کا نقصان پہنچے گا۔ اس کی غلط روی کا نہیں۔ اس لئے کہ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَيْهَا ۔ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِّزْرَ اُخْرٰى (۶/۱۶۵) ہر شخص اپنی غلط روی کا خمیازہ خود بھگتے گا۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا، کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔

لیکن اپنی اصلاح کرنے کے بعد، مومن کی یہ کیفیت نہیں ہوتی کہ وہ ہر ایک پر اپنی نیکیوں کی دھونس جماتا رہتا ہے اور معاشرہ میں بڑا پاکباز بن کر، اپنے آپ کو فریب دیتا اور دوسروں پر رعب گانٹھتا ہے۔ قطعاً نہیں۔

اپنی پاکبازی کی دھونس نہ جماؤ

اس لئے کہ اس کے سامنے یہ اصول ہوتا ہے کہ فَلَا تُزَكُّوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۔ هُوَ اَعْلَمُ بِمَنِ اتَّقٰى (۵۳/۳۲)۔ یونہی اپنے آپ کو پاکباز نہ ٹھہراتے پھرو۔ اس کا فیصلہ میزانِ خداوندی کی رو سے ہوتا ہے کہ تم میں سے کون تقویٰ شعار ہے۔ مومن

کا تو شعار یہ ہے کہ اس میں جس قدر زیادہ خوبیاں پیدا ہوتی جاتی ہیں، وہ اسی قدر (شاخِ ثمردار کی طرح) اور جھکتا چلا جاتا ہے۔ وَعِبَادُ الرَّحْمٰنِ الَّذِیْنَ یَمْشُوْنَ عَلَی الْاَرْضِ هَوْنًا (۲۵/۶۳)۔ اللہ کے بندوں کا انداز یہ ہے کہ وہ اپنے اندر جھوٹا تکبر پیدا نہیں ہونے دیتے۔ خوبیوں کا وزن انہیں اور جھکا دیتا ہے۔

لیکن جھکنے کے معنی یہ نہیں کہ وہ ہر ایک سے دبتے چلے جاتے ہیں۔ قطعاً نہیں۔ وہ جھکتے ہیں حق کے سامنے۔

باطل کا مقابلہ کرتے ہیں

لیکن جو حق کی مخالفت کرتا اور اس سے سرکشی برتتا ہے، اس کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ جہاں مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِیْنَ مَعَهٗ کو رُحَمَآءُ بَیْنَهُمْ کہا ہے (یعنی آپس میں، ایک دوسرے کے ساتھ، بڑی محبت اور نرمی سے سلوک کرنے والے) وہاں انہیں اَشِدَّآءُ عَلَی الْكُفَّارِ (۴۸/۲۹)۔ بھی قرار دیا گیا ہے۔ یعنی حق کی مخالفت کرنے والوں کے مقابلہ میں چٹان کی طرح سخت۔ مومن کی کیفیت یہ ہے کہ،

جس سے جگرِ لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان

خود نبی اکرمؐ کے متعلق قرآن میں ہے کہ "یہ خدا کی رحمت ہے کہ آپؐ اس قدر نرم دل واقع ہوئے ہیں۔ اگر آپؐ سخت مزاج اور سنگدل ہوتے تو آپ کی جماعت کے افراد آپ سے الگ ہو جاتے" (۳/۱۵۸)۔ لیکن اس کے ساتھ ہی حضورؐ سے تاکیداً کہا گیا کہ یٰۤاَیُّهَا النَّبِیُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِیْنَ وَاغْلُظْ عَلَیْهِمْ (۹/۷۳)۔ اے نبیؐ! جو لوگ حق کی مخالفت کرتے ہیں۔ یا جو تمہارے ساتھ رہتے ہوئے، منافقانہ روش اختیار کرتے ہیں، ان سے جہاد کرو۔ اور ان کے خلاف شدت اختیار کرو۔ یعنی جو لوگ کھلے بندوں حق کی مخالفت کریں اور سرکشی اختیار کریں۔ یا جو لوگ منافقت برتیں، ان کے ساتھ نرمی کا برتاؤ نہیں کیا جائے گا۔ ان کی مخالفت یا منافقت کو سختی سے روکا جائے گا۔ یاد رکھئے! مومنین کے معاشرہ میں، منافقین کا وجود —— یعنی وہ لوگ جو بظاہر کچھ اور بات کریں اور ان کے دل میں کچھ اور ہو —— ایک زہر آلود پھانس ہوتی ہے،

منافق کی مخالفت

جس کا علاج نہایت ضروری ہے۔ اس کے لئے اگر نوکِ نشتر کی بھی ضرورت پڑے تو اس میں بھی تامل نہیں کرنا چاہئے۔ مومن کی نرم مزاجی کے یہ معنی نہیں کہ وہ منافقین کے سامنے بھی جھک کر رہتا ہے۔ ایسا کرنا تو خود منافقت اور مداہنت ہوگی۔ وہ منافق سے برملا کہہ دیتا ہے کہ تم منافقت برتتے ہو۔ ہم تمہارے دوست نہیں ہو سکتے۔ اور دوسروں کو بھی اس کی منافقت سے آگاہ کرتا ہے تاکہ وہ کسی کو دھوکا نہ دے سکے۔ اس باب میں قرآن کی تعلیم بڑی واضح اور اس کی تاکید بڑی سخت ہے۔ اس لئے مومنین، حق کے مخالفین اور منافقین سے برملا کہہ دیتے ہیں کہ تمہارے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ تم ہمارے دوست اور رازدار نہیں ہو سکتے۔ سورۂ توبہ میں ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْۤا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِیَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَی الْاِیْمَانِ۔ وَمَنْ یَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓىِٕكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ (۹/۲۳)۔

اے جماعتِ مومنین! اگر تمہارے باپ اور بھائی بھی ایمان کے مقابلہ میں کفر کو زیادہ عزیز رکھتے

ہیں، تو انہیں اپنا دوست مت بناؤ۔ تم میں سے جو کوئی انہیں اپنا دوست رکھے گا تو اسے معلوم ہونا چاہیئے کہ اس کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں۔

اتنا ہی نہیں۔ عزیز سے عزیز دوست۔ قریبی سے قریبی رشتہ دار۔ بیوی بچے۔ مال و دولت۔ سامانِ زیست۔ متاعِ حیات۔ غرضیکہ دنیا کی کوئی چیز بھی، مومن کے نزدیک، ایمان اور اسلامی نظام کے مقابلہ میں عزیز نہیں ہو سکتی۔ یہ سب چیزیں اپنی اپنی جگہ وجہِ جاذبیت ہیں۔ لیکن جب ان میں اور ایمان کے کسی تقاضے میں تصادم ہو، تو ان میں سے کسی شئے کو بھی ایمانی تقاضے پر ترجیح نہیں دی جا سکتی۔ یہی ایمان کا تقاضا ہے اور مومنین کا شعار۔ ان کے

ایمان کے معنی

خدا کا حکم یہ ہے کہ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ۔ اے رسولؐ! ان سے کہدو کہ اگر تمہارے ماں باپ۔ بہن بھائی۔ بیوی بچے۔ عزیز رشتہ دار۔ وہ مال و دولت جسے تم اتنی محنت سے کماتے ہو۔ وہ کاروبار جس کے مندا پڑ جانے سے تم خائف رہتے ہو اور وہ محلات جو تمہیں اس قدر پسند ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی چیز اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ۔ تمہیں خدا اور اس کے رسول اور خدا کی راہ میں جہاد سے زیادہ عزیز ہو گئی۔ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ تو تم انتظار کرو۔ تا آنکہ خدا کا قانونِ مکافات تمہاری اس روش کا تباہ کن نتیجہ تمہارے سامنے لے آئے۔ تمہاری یہ روش مومنین کی روش نہیں۔ فاسقین کی ہوگی۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝ (۹/۲۴)۔ اور خدا کا قانون یہ ہے کہ فاسقین پر ——— یعنی جو صحیح راستہ چھوڑ کر غلط راہوں پر چل نکلیں۔ کبھی کامیابیوں کی راہ کشادہ نہیں ہوتی۔

مومن کی تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ اس نے اپنا مال اور جان، سب خدا کے ہاتھ بیچ دیئے ہوتے ہیں۔ جس دن وہ خدا پر ایمان لاتا ہے خدا اس معاہدہ کا اعلان کر دیتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ ؕ دیکھو کہ اللہ نے مومنین کا جان اور مال، جنت کے عوض خرید لیا ہے۔ ان کی کیفیت یہ

مال اور جان خدا کے

کہ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ (۹/۱۱۱)۔ وہ خدا کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ پھر یا تو فاتح و منصور واپس لوٹتے ہیں۔ اور یا میدانِ جنگ میں جان دے دیتے ہیں۔ ان مومنین کی صفات یہ ہیں کہ اَلتَّآئِبُوْنَ۔ سفرِ حیات میں وہ جہاں دیکھتے ہیں کہ ان کا قدم غلط سمت کی طرف اٹھ گیا ہے' وہ وہیں رک جاتے ہیں، اور جہاں سے قدم غلط اٹھا تھا وہاں واپس آ کر صحیح راستے پر ہو لیتے ہیں۔

مومنین کی صفات

اَلْعٰبِدُوْنَ۔ وہ قوانینِ خداوندی کی پوری پوری اطاعت کرتے ہیں۔ اَلْحٰمِدُوْنَ۔ وہ انفس و آفاق کی ہر شئے پر غور و فکر کرنے کے بعد علیٰ وجہ البصیرت اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ کارگہ کائنات کی ایک ایک شئے اپنے خالق کی حمد و ستائش کی منہ بولتی تصویر ہے۔ اَلسَّآئِحُوْنَ۔ وہ اس مقصد کے لئے دنیا بھر کا سفر کرتے ہیں۔ اَلرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ۔ وہ ہمیشہ قانونِ خداوندی کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ اور دل کے پورے جھکاؤ سے' اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کرتے ہیں۔ اَلْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَالنَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وہ ان باتوں کا حکم دیتے ہیں جنہیں قانونِ خداوندی صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکتے ہیں جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے۔ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ۔ وہ ان تمام حدود کی نگہداشت کرتے ہیں جنہیں قانونِ

خداوندی نے متعین کیا ہے، اور ان کے اندر رہتے ہوئے صحیح آزادی کی زندگی بسر کرتے ہیں۔ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ (۹/۱۱۲)۔
یہ ہیں وہ مومن جن کے لئے دُنیا اور آخرت کی زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں ہیں۔

یہ ہیں مختصر الفاظ میں، وہ صفات جن کے حامل انسان کو مومن کہا جاتا ہے۔ واضح رہے کہ ان تمام صفات میں مرد اور عورت دونوں شامل ہیں۔ قرآن کریم میں مومن کی کوئی ایک خصوصیت بھی ایسی نہیں جو صرف مردوں کے لئے

مردوں اور عورتوں دونوں کی خصوصیات

مخصوص ہو اور اس میں عورتیں شامل نہ ہوں۔ اگرچہ خود لفظ "مومنین" کے اندر مرد اور عورتیں از خود شامل ہیں لیکن قرآن کریم نے ایک مقام پر مومن مردوں اور مومن عورتوں کا ذکر اس طرح بہ تخصیص کیا ہے کہ مصافِ زندگی میں دونوں، ایک ہی صف میں، ساتھ ساتھ چلتے صاف دکھائی دیتے ہیں۔ سورۂ احزاب کی آیت (۳۳/۳۵) کو دیکھئے۔ اس میں کس وضاحت اور صراحت سے کہا گیا ہے کہ اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی اطاعت سے اپنی تکمیلِ ذات کر سکتے ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (اَلْمُسْلِمِيْنَ وَالْمُسْلِمٰتِ) اگر مرد اس پارٹی (جماعت) کے رکن بن سکتے ہیں جو خدا کے قانون کے اٹل نتائج پر یقین رکھتے ہوئے امنِ عالم کی ذمہ دار ہو تو عورتیں بھی اس جماعت کی اسی طرح رکن ہو سکتی ہیں (اَلْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ) اگر مردوں میں یہ صلاحیت ہے کہ وہ اپنی استعداد کو اس طرح سنبھال کر رکھیں کہ ان کا استعمال صرف قانونِ خداوندی کے مطابق ہو تو یہی صلاحیت عورتوں میں بھی ہے (وَالْقٰنِتِيْنَ وَالْقٰنِتٰتِ) اگر مرد اپنے دعوئے ایمان کو اعمال سے سچ کر دکھانے کے اہل ہیں تو عورتیں بھی اس کے اہل ہیں (وَالصّٰدِقِيْنَ وَالصّٰدِقٰتِ) اگر مرد ثابت قدم رہ سکتے ہیں تو عورتیں بھی رہ سکتی ہیں (وَالصّٰبِرِيْنَ وَالصّٰبِرٰتِ) اگر مرد اس خصوصیت کے حامل ہو سکتے ہیں کہ جوں جوں ان کی صلاحیتیں بڑھتی جائیں وہ شاخِ ثمردار کی طرح قانونِ خداوندی کی اطاعت میں اور جھکتے چلے جائیں تو یہی خصوصیت عورتوں میں بھی ہے۔ (وَالْخٰشِعِيْنَ وَالْخٰشِعٰتِ) اگر مردوں میں ایثار کا مادہ ہے تو عورتوں میں بھی ہے (وَالْمُتَصَدِّقِيْنَ وَالْمُتَصَدِّقٰتِ) اگر مرد اپنے آپ پر ایسا کنٹرول رکھ سکتے ہیں کہ انہیں جہاں سے روکا جائے وہ رک جائیں، تو عورتوں میں بھی اس کی صلاحیت ہے (وَالصَّآئِمِيْنَ وَالصّٰٓئِمٰتِ)۔ اگر مرد اپنے جنسی میلانات کو ضوابط کی پابندی میں رکھ سکتے ہیں تو عورتیں بھی ایسا کر سکتی ہیں (وَالْحٰفِظِيْنَ فُرُوْجَهُمْ وَالْحٰفِظٰتِ)۔ اگر مرد قانونِ خداوندی کو شعوری طور پر سمجھنے اور اسے ہر وقت پیشِ نظر رکھنے کے اہل ہیں تو عورتوں میں بھی اس کی اہلیت ہے (وَالذّٰكِرِيْنَ اللّٰهَ كَثِيْرًا وَّالذّٰكِرٰتِ) جب یہ صلاحیتیں دونوں میں موجود ہیں تو ان کے نتائج بھی دونوں کے لئے یکساں طور پر موجود ہوتے چاہئیں۔ فلہٰذا نظامِ خداوندی میں دونوں کے لئے حفاظت کا سامان اور اجرِ عظیم موجود ہے (اَعَدَّ اللّٰهُ لَهُمْ مَّغْفِرَةً وَّاَجْرًا عَظِيْمًا)۔ سورۂ توبہ میں مومنین کی جن صفات کا ذکر کیا گیا ہے (اور جنہیں پہلے بیان کیا جا چکا ہے) ان میں ایک صفت اَلسَّآئِحُوْنَ بھی ہے۔ یعنی دُنیا کا سفر، یا سیر و سیاحت کرنے والے۔ عورت کے متعلق جو نظریہ ہمارے ذہنوں میں راسخ ہے، اس کے پیشِ نظر خیال گزر سکتا تھا کہ کم از کم اس صفت میں مومن عورتیں شریک نہیں ہوں گی۔ قرآن کریم نے سٰٓئِحٰتٌ (۶۶/۵)۔ کا ذکر خاص طور پر کر کے، اس غلط فہمی کا بھی ازالہ کر دیا اور اس کی وضاحت کر دی کہ اس صفت میں بھی مومن عورتیں مردوں کے ساتھ برابر کی شریک ہیں۔

☆

یہ ہیں وہ صفات وخصائص جن کے حامل افراد سے قرآن وہ اُمّت تشکیل کرتا ہے جو تمام عالمِ انسانیت میں مرکزی حیثیت رکھتی ہے۔ وَكَذَٰلِكَ جَعَلْنَاكُمْ أُمَّةً وَسَطًا لِّتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا (۲/۱۴۳)۔ اس طرح ہم نے تمہیں ایک مرکزی اُمّت بنا دیا۔ تاکہ تم عالمِ انسانیت کے اعمال کی نگرانی کرو (کہ وہ حق وانصاف پر قائم رہیں) اور تمہارا رسول تمہارے اعمال کی نگرانی کرے کہ تم نظامِ خداوندی کے مطابق چلتے رہو۔ دوسری جگہ ہے کُنتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ۔ تم ایک بہترین قوم ہو جسے نوعِ انسان کی بھلائی کے لئے پیدا کیا گیا ہے ـــــ یہ بھلائی کیا ہے؟ یہ کہ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ (۳/۱۱۰)۔ تم ان باتوں کا حکم دیتے ہو جنہیں وحیِ خداوندی مستحسن قرار دیتی ہے اور ان سے روکتے ہو جنہیں وہ ناپسندیدہ ٹھہراتی ہے۔ یعنی یہ لوگ (مومنین) پہلے اپنی زندگی وحیِ خداوندی کے قالب میں ڈھالتے ہیں۔ پھر ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس سے دوسرے لوگ بھی وحی کا اتباع کرتے جائیں ـــــ اسے قرآن کی اصطلاح میں نظامِ صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اور مقصد اس تگ وتاز سے یہ ہے کہ تمام افرادِ انسانیہ کو وہ ذرائع اور سامان میسر آتا رہے جس سے اس کی طبیعی زندگی اور ذات کی نشوونما ہوتی چلی جائے۔ اسے ایتائے زکوٰۃ کہتے ہیں۔ یعنی نوعِ انسان کو سامانِ نشوونما بہم پہنچانا۔ چنانچہ قرآن کریم میں جماعتِ مومنین کے ان ہر دو فرائض (ذمہ داریوں) کو بار بار دہرایا گیا ہے ـــــ وَيُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ الزَّكَاةَ (۹/۷۱)۔ حتیٰ کہ ان کی مملکت اور حکومت کی غرض وغایت بھی یہی بتائی گئی ہے۔ سورۂ حج میں ہے۔ الَّذِينَ إِن مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ أَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ وَأَمَرُوا بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنكَرِ وَلِلَّهِ عَاقِبَةُ الْأُمُورِ (۲۲/۴۱)۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر انہیں ملک میں اختیار واقتدار حاصل ہو گیا تو یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے اور نوعِ انسان کی نشوونما کا انتظام کریں گے۔

اقامتِ صلوٰۃ وایتائے زکوٰۃ

ان باتوں کا حکم دیں گے جنہیں قرآن صحیح تسلیم کرتا ہے اور ان سے روکیں گے جنہیں وہ ناپسندیدہ قرار دیتا ہے اور ان کے تمام معاملات منشائے خداوندی کے مطابق طے ہوں گے۔ اس مقام پر ایک نکتہ کی وضاحت ضروری نظر آتی ہے۔ ہمارے ہاں یہ خیال عام کیا جاتا ہے کہ اسلام میں، عورتوں کو نظامِ مملکت میں شریک نہیں کیا جا سکتا۔ یہ نظریہ قرآنِ کریم کی تعلیم کے خلاف ہے۔ جو آیت ابھی ابھی آپ کے سامنے آئی ہے اس میں اسلامی حکومت کا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر بتایا گیا ہے، اور دوسرے مقام پر اس کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ فریضہ مردوں اور عورتوں دونوں کا ہے۔ تنہا مردوں کا نہیں۔ سورۂ توبہ میں ہے۔ وَالْمُؤْمِنُونَ وَالْمُؤْمِنَاتُ بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ يَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنكَرِ ...... (۹/۷۱)۔ مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ ان کا فریضہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر ہے۔

بہرحال، کہا یہ جا رہا تھا کہ جماعتِ مومنین کا فریضہ ہے کہ وہ دُنیا سے بُرائیوں کی روک تھام کا انتظام کریں۔ لیکن یہ روک تھام اندھی قوت کے زور سے نہیں ہوگی۔ وہ بھلائیوں کو اس قدر عام کرتے چلے جائیں گے کہ بُرائیاں خود بخود اپنی جگہ چھوڑتی جائیں، جس طرح تاریکی دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ روشنی لے آیئے۔ وَيَدْرَءُونَ بِالْحَسَنَةِ السَّيِّئَةَ (۲۸/۵۴)۔ البتہ جو لوگ نظامِ حق وصداقت کے خلاف سرکشی پر اتر آئیں اور ظلم واستبداد

سے کسی طرح باز ہی نہ آئیں، تو خلقِ خدا کو ان کے جور و ستم سے محفوظ رکھنے کے لئے، قوت کا استعمال ناگزیر ہوگا۔

شمشیر زن مومن

یہی وہ مقصد ہے جس کے لئے قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَیِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِیْزَانَ لِیَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ج ہم نے اپنے رسولوں کو واضح دلائل دے کر بھیجا کہ وہ لوگوں کو علم و بصیرت کی رُو سے حق کی دعوت دیں۔ پھر ان کے ساتھ ضوابطِ قانون بھی نازل کئے کہ دُنیا میں عدل قائم رکھا جا سکے۔ لیکن جو لوگ نہ دلائل و براہین کی رو سے مانیں۔ نہ قانونِ عدل و انصاف کی پابندی اور احترام کریں تو ان کے لئے: وَاَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ (۵۷/۲۵)۔ ہم نے شمشیرِ خاراشگاف بھی نازل کی۔ جماعتِ مومنین، شمشیر کا استعمال مظلوم کی حمایت اور ظالم کے ظلم کی مدافعت کے لئے کرتی ہے۔ اس مقصد کے لئے اگر دُنیا کی کوئی اور قوم کسی قسم کی کوشش کرتی ہے تو جماعتِ مومنین ان کے ساتھ تعاون کرتی ہے۔ لیکن غلط کاموں میں کسی کا ساتھ نہیں دیتی۔ وَتَعَاوَنُوْا عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ (۵/۲)۔ ان کا شعار ہوتا ہے۔ اس لئے کہ وہ جانتے ہیں کہ مَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً یَّكُنْ لَّهٗ نَصِیْبٌ مِّنْهَا

تعاون

وَمَنْ یَّشْفَعْ شَفَاعَةً سَیِّئَةً یَّكُنْ لَّهٗ كِفْلٌ مِّنْهَا (۴/۸۵)۔ جو کسی اچھے کام میں دوسرے کے ساتھ کھڑا ہو جاتا ہے تو اس کے خوشگوار نتائج میں اس کا بھی حصّہ ہوتا ہے۔ اور جو کسی خراب کام میں کسی کا ساتھ دیتا ہے، تو اس کے مضر نتائج کی ذمہ داری اس پر بھی عائد ہوتی ہے۔

یہ ہیں وہ بلند مقاصدِ حیات جن کے لئے جماعتِ مومنین کے افراد ایک دوسرے کی باہوں میں باہیں ڈالے زندگی کی متلاطم ندیوں کو مردانہ وار پار کئے چلے جاتے ہیں۔ اس لئے کہ انہیں تعلیم ہی یہ دی گئی ہے کہ یٰۤاَیُّهَا

ربط باہمی

الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اصْبِرُوْا وَصَابِرُوْا وَرَابِطُوْا۔ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ (۳/۱۹۹)۔ تم اپنے مسلک پر نہایت استقامت سے جمے رہو اور ایک دوسرے کی استقامت کا موجب بنو۔ ایک دوسرے کے ساتھ جُڑ کر رہو۔ اور ہر قدم پر قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرو۔ یہی وہ روش ہے جس سے تمہیں سفرِ حیات میں کامیابی حاصل ہوگی۔ اس طرح ایک دوسرے کے ساتھ جڑ کر، كَاَنَّهُمْ بُنْیَانٌ مَّرْصُوْصٌ (۶۱/۴) گویا ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہے کہ حوادثِ زمانہ کی سرکش موجیں اس سے آکر ٹکرائیں تو اپنا سر پھوڑ کر پیچھے ہٹ جائیں۔ ان کے اس ارتباطِ باہمی اور باہمدگر پیوستگی کا ذریعہ، تمسک بالقرآن (خدا کی کتاب کے ساتھ وابستگی) ہوتا ہے کہ ان سے کہا گیا ہے کہ وَاعْتَصِمُوْا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِیْعًا وَّلَا تَفَرَّقُوْا (۳/۱۰۲)۔ تم خدا کی کتاب کے ساتھ، سب کے سب مل کر، پوری مضبوطی سے وابستہ رہو۔ اور آپس میں تفرقہ پیدا مت کرو۔ اس لئے کہ باہمی تفرقہ ـــــ اُمت کا فرقوں میں بٹ جانا ـــــ توحید نہیں، شرک ہے۔ وَلَا تَكُوْنُوْا مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ۔ مِنَ الَّذِیْنَ فَرَّقُوْا دِیْنَهُمْ وَكَانُوْا شِیَعًا۔ كُلُّ حِزْبٍۢ بِمَا لَدَیْهِمْ فَرِحُوْنَ (۳۰/۳۲)۔ دیکھنا! تم کہیں

تفرقہ شرک ہے

(اسلام لانے کے بعد پھر) مشرک نہ بن جانا۔ یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین میں فرقے پیدا کر لئے اور خود بھی ایک گروہ بن گئے۔ اس سے کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ میں حق پر ہوں (اور باقی سب باطل پر ہیں)۔ اور یوں اُمت کی اجتماعیت کا شیرازہ بکھر جاتا ہے۔ اس کے برعکس اُمت کی وحدت اور استقامت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان پر رحمتوں کے

فرشتے نازل ہوتے ہیں۔ جو انہیں دنیا اور آخرت میں زندگی کی خوشگواریوں کی بشارتیں دیتے ہیں۔ اِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا تَتَنَزَّلُ عَلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَلَّا تَخَافُوْا وَلَا تَحْزَنُوْا وَاَبْشِرُوْا بِالْجَنَّةِ الَّتِيْ كُنْتُمْ تُوْعَدُوْنَ۔ یہ واقعہ ہے کہ جو لوگ اس حقیقت پر ایمان لاتے ہیں کہ ہمارا نشوونما دینے والا اللہ ہے۔ اور پھر اس دعویٰ پر جم کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ان پر فرشتے نازل ہوتے ہیں جو ان سے کہتے ہیں کہ تم نہ کسی قسم کا خوف کھاؤ۔ نہ افسردہ خاطر ہو۔ اور اس جنتی زندگی کی خوشخبری لو جس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ نَحْنُ اَوْلِيٰٓؤُكُمْ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَفِي الْاٰخِرَةِ۔ ہم دنیا میں بھی تمہارے رفیق اور ساتھی ہیں اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَشْتَهِيْٓ اَنْفُسُكُمْ۔ وَلَكُمْ فِيْهَا مَا تَدَّعُوْنَ۔ (۴۱/۳۰-۳۱)۔ تمہیں دنیا اور آخرت میں، جو تمہارا جی چاہے گا ملے گا۔ جو مانگو گے' پاؤ گے۔ ہر قسم کی سربلندیاں اور سرفرازیاں تمہارے حصے میں آئیں گی۔ اور یہ سب تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہوں گی ـــ تِلْكُمُ الْجَنَّةُ اُوْرِثْتُمُوْهَا بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ (۴۳/۷۲)۔ یہ وہ جنت ہے جس کے تم' اپنے اعمال کی وجہ سے' مالک بنائے گئے ہو۔

نزولِ ملائکہ

یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حامل انسانوں کو مومن کہا گیا ہے۔ انہیں زندگی کی جن خوشگواریوں اور سربلندیوں کی بشارت دی گئی ہے' وہ انہی خصوصیات کا فطری نتیجہ ہوتی ہیں۔ محض مومن کہلانے اور مسلمان نام رکھا لینے سے یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ (۴/۱۲۳)۔ یہ نتائج نہ تمہاری خوش فہمیوں سے حاصل ہو سکتے ہیں نہ ان اہلِ کتاب کی خالی تمناؤں سے۔ یہ تو صرف ان خصوصیات کے پیدا کرنے سے حاصل ہوں گے جنہیں مومنین کی صفات کہہ کر پکارا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اگر کسی میں یہ خصوصیات موجود نہ ہوں' اور وہ نماز۔ روزہ۔ حج۔ زکوٰۃ جیسے "دینی اعمال" پر بھی محض میکانکی طور پر کاربند ہو، تو بھی یہ نتائج حاصل نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے نہایت واضح الفاظ میں کہدیا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ۔ نیکی یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ۔ اس کے لئے پہلی شرط یہ ہے کہ تم ان بلند حقیقتوں پر علیٰ وجہ البصیرت یقین رکھو جنہیں اجزائے ایمان کہا گیا ہے ـــ یعنی خدا اور اس کے قانونِ مکافات پر ایمان۔ زندگی کے تسلسل پر ایمان۔ وحی کی رُو سے دیئے ہوئے ضابطۂ قوانین پر ایمان۔ انبیاء اور ملائکہ پر ایمان ـــ نیکی اس کی ہے جو ان حقیقتوں پر یقینِ محکم رکھے اور پھر اٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِي الرِّقَابِ۔ مال و دولت کی محبت کے باوجود اسے دوسروں کی پرورش کے لئے دے دے۔ وہ رشتے دار ہوں یا ایسے لوگ جو معاشرہ میں تنہا رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے یا ان میں کام کاج کی استطاعت نہ رہے۔ یا ایسے مسافر جو زادِ سفر سے محروم رہ جائیں۔ یا وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لئے کافی نہ ہو۔ یا وہ دوسروں کے پنجۂ استبداد میں گرفتار ہوں۔ ان مقاصد کے لئے مال و دولت کا پیش کر دینا۔ یہ نیکی ہے۔ مختصر الفاظ میں نیکی یہ ہے کہ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ۔ ایسا نظام قائم کیا جائے جس میں تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کریں اس وقت فریضۂ صلوٰۃ کی پابندی کریں اور نوعِ انسان کی پرورش کا سامان مہیا کریں۔ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ

نیکی کا صحیح مفہوم

وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ج نیکی ان کی ہے جو اپنے عہد و پیمان کا احترام کریں اور قول اقرار کے پکے ہوں۔ وَالصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ط اور جب مشکلات کا سامنا ہو تو نہایت ثابت قدمی سے ان کا مقابلہ کریں۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ط وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ○ (۲/۱۷۷)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو اپنے دعویٰ ایمان کو اپنے اعمال سے سچا ثابت کر دکھاتے ہیں۔ اور یہی ہیں وہ جو متقی کہلانے کے مستحق ہیں۔ نہ وہ جو محض رسمی طور پر نماز روزہ کی پابندی کر کے اس فریب میں مبتلا رہتے ہیں کہ ہم پکے مومن ہیں اور بڑے نیک کام کر رہے ہیں۔ یہی نہیں۔ بلکہ ایسے خیراتی کام جنہیں عام طور پر "کارِ خیر" سمجھا جاتا ہے، وہ بھی نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے جد و جہد کے مقابلہ میں کچھ حیثیت نہیں رکھتے۔ سورۂ توبہ میں ہے اَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَآجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَجٰهَدَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ط۔ کیا تم سمجھتے ہو کہ حاجیوں

خیرات کے کام

کے لئے سبیلیں لگا دینے والا یا خانہ کعبہ کی زیبائش و آرائش اور آباد کاری کے کاموں میں حصّہ لینے والا، اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے جو خدا اور اس کے قانونِ مکافات اور حیاتِ اخروی پر ایمان رکھے اور نظامِ خداوندی کے قیام کے لئے مسلسل جد و جہد کرتا رہے! تم اپنی خوش عقیدگی کی بناء پر کچھ ہی کیوں نہ سمجھو۔ لَا يَسْتَوٗنَ عِنْدَ اللّٰهِ ط میزانِ خداوندی میں یہ دونوں کبھی ہم وزن نہیں ہو سکتے۔ ایسا سمجھنا بڑی زیادتی ہے۔ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ○ (۹/۱۹)۔ اور خدا کا فیصلہ یہ ہے کہ اس قسم کی زیادتی کرنے والوں پر کامیابی کی راہیں کبھی نہیں کھلا کرتیں۔ یہودیوں کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ اسی قسم کی خود فریبی میں مبتلا تھے۔ انہوں نے معاشرہ کا نظام ایسا قائم کر رکھا تھا جس میں کمزور، غریب، ناتواں افراد، اپنا گھر بار چھوڑ کر باہر نکل جانے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ جب وہ اس طرح باہر نکل کر غیر محفوظ ہو جاتے اور دوسروں کے چنگل میں پھنس جاتے تو پھر وہی ان کے ابنائے وطن، جن کی چیرہ دستیوں سے تنگ آ کر وہ وطن چھوڑنے پر مجبور ہوئے تھے، خیرات کے پیسوں سے ان کا فدیہ ادا کرتے اور سمجھتے کہ ہم بڑا ثواب کا کام کر رہے ہیں۔ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ (۲/۸۵)۔ حالانکہ ایسا نظام قائم کرنا جس میں معاشرہ کے غریب اور کمزور افراد، مظلومیت کا شکار ہو جائیں، ایسا جرمِ عظیم ہے جس کا کفارہ اس قسم کے خیرات کے کام کبھی نہیں بن سکتے۔ جماعتِ مومنین اس قسم کی خود فریبی کا شکار نہیں ہوتی۔ وہ نظام ایسا قائم کرتے ہیں جس میں اس قسم کے انفرادی خیراتی کاموں کی ضرورت ہی پیش نہ آئے۔ قرآن تسلیم کرتا ہے کہ اہلِ کتاب میں بھی ایسے لوگ موجود ہیں جو انفرادی طور پر دیانتدار ہیں لیکن اس کے باوجود وہ انہیں نظامِ خداوندی کی طرف آنے کی دعوت دیتا ہے۔ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ اس قسم کا ہوتا ہے جس میں ان کی انفرادی نیکیاں خوشگوار نتائج پیدا نہیں کر سکتیں۔ دیکھئے قرآن اس حقیقت کو کیسے واضح اور بلیغ انداز میں پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ج وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ط ان اہلِ کتاب میں وہ بھی ہے جس کے پاس اگر چاندی سونے کا ڈھیر بھی بطور امانت رکھ دیا جائے تو وہ اسے جوں کا توں واپس کر دے۔ اور ایسا بھی کہ اگر اس پر ایک روپے کا بھی اعتماد کرو تو وہ اسے کبھی واپس نہ کرے بجز اس کے کہ تم اس کے سر پر ڈنڈا لے کر سوار

رہو۔ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ یہ اس لئے کہ ان کا نظامِ معاشرہ قومی عصبیت کی بنیادوں پر قائم ہے جس میں یہ عقیدہ دل کی گہرائیوں میں راسخ کر دیا جاتا ہے کہ تم دوسری اقوام کے لوگوں کے ساتھ جو جی میں آئے کرو۔ اس سے تم پر کوئی الزام نہیں ہوگا۔ اور تماشا یہ کہ ان کے مذہبی پیشوا انہیں یہ بتاتے ہیں کہ یہ شریعتِ خداوندی کے عین مطابق ہے حالانکہ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ (۳/۷۵)۔ یہ خدا کے خلاف صریح کذب و افترا ہے اور ایسا کہنے والے خوب جانتے ہیں کہ یہ جھوٹ ہے۔

قرآنِ کریم نے مثال تو یہودیوں کی دی ہے کہ وہ ایسا معاشرہ قائم کرتے تھے جس میں ان کے کمزور اور غریب بھائی گھروں سے بے گھر ہونے پر مجبور ہو جائیں اور اس طرح جب وہ دوسروں کے ہاتھوں گرفتار ہو جاتے تھے تو انہیں چھڑانے کے لئے فنڈ اکٹھا کرتے تھے اور اسے بڑا ثواب کا کام سمجھتے تھے۔ لیکن اس سے اس نے اصول بہت بلند پیش کیا ہے۔ یعنی ایسا معاشرہ قائم کرنا جس میں غریب لوگ محتاج سے محتاج تر ہوتے جائیں اور اس کے بعد ان کی طرف خیرات کے چند ٹکے پھینک کر یہ سمجھنا کہ ہم نے بڑا ثواب کا کام کیا ہے جرمِ عظیم ہے فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ .... (۲/۸۵)۔ جو قوم بھی ایسا کرے گی اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ وہ دنیا میں بھی ذلیل و خوار ہوگی اور آخرت میں بھی سخت عذاب کی مستحق۔

مومن اور مسلم کا فرق

الغرض یہ ہیں وہ خصوصیات جن کے حاملین کو مومن کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم نے مومن اور مسلم کے الفاظ اکثر مقامات پر ہم معنی استعمال کئے ہیں۔ لیکن ایک جگہ ایسی تشریح بھی کی گئی ہے جس سے "بعض گوشوں میں" ان دونوں کا فرق سامنے آجاتا ہے۔ سورۂ حجرات میں ہے۔ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ۭ یہ بدوی قبائل، جو اسلامی مملکت کے قیام کے بعد "مسلمان ہوئے ہیں" کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں۔ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا۔ ان سے کہو کہ یہ نہ کہو کہ ہم ایمان لے آئے ہیں اور اس طرح مومن بن گئے ہیں۔ بلکہ یہ کہو کہ ہم اس مملکت کے سامنے جھک گئے ہیں وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ۭ ابھی تک ایمان تمہارے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا .... اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝ (۴۹/۱۴-۱۵)۔ مومن کہلانے کے مستحق وہ ہیں جو خدا اور اس کے رسول پر، دل کی کامل رضامندی سے ایمان لاتے ہیں جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے دل میں کسی قسم کے شک و شبہ کا گزر تک نہیں ہوتا۔ پھر وہ، اپنی جان اور مال سے، خدا کی راہ میں جہاد کرتے رہتے ہیں۔ یہ ہیں وہ جو اپنے دعوےٰ ایمان میں سچے ہوتے ہیں۔

اس سے ہمارے سامنے مسلم اور مومن کا فرق آجاتا ہے۔ یوں سمجھئے کہ مسلم وہ ہے جس سے احکامِ خداوندی کی اطاعت، قانون کے ذریعے جبراً کرائی جاتی ہے۔ اور ان احکام کی اطاعت کا جذبہ جس کے دل کی گہرائیوں سے ابھرتا ہے اسے مومن کہتے ہیں۔ مومن کی ذات (PERSONALITY) کی نشوونما اس طرح ہو جاتی ہے کہ وہ تمام صفات و خصوصیات جن کا ذکر گزشتہ اوراق میں کیا گیا ہے، اس کے مختلف گوشے (FACETS) بن

جاتے ہیں، اس لئے وہ ان صفات کا فطری مظہر ہوتا ہے جس طرح سورج، روشنی اور حرارت کا فطری مظہر ہے۔ اسلامی معاشرہ کے اندر اگر "مسلم" ان قوانین کی اطاعت سے ان کے اثرات کو اپنے دل میں جذب کرتا جاتا ہے اور یوں اس کی ذات کی نشوونما ہوتی چلی جاتی ہے۔ تو وہ بھی مقام مومن تک پہنچ جاتا ہے۔ اس لئے جہاں اعراب سے کہا گیا کہ وہ ابھی اپنے آپ کو مومن نہ کہیں کیونکہ ہنوز ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں نہیں اترا، وہاں ان سے یہ بھی کہہ دیا گیا ہے کہ وَإِن تُطِيعُوا اللَّهَ وَرَسُولَهُ لَا يَلِتْكُم مِّنْ أَعْمَالِكُمْ شَيْئًا ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ‎(۴۹/۱۴)۔ اگر تم نظامِ خداوندی کی اطاعت کرتے جاؤ گے تو تمہارے اعمال میں کسی قسم کی کمی نہیں کی جائے گی۔ ان کے نتائج مرتب ہوتے چلے جائیں گے۔ اس طرح تخریبی عناصر سے تمہاری ذات کی حفاظت ہو جائے گی اور اس کی نشوونما کا سامان بھی تمہیں ملتا جائے گا۔ بشرطیکہ تم نے یہ اطاعت، محض رسمی طور پر نہ کی۔ اگر ایسا کرو گے تو مسلم کے مسلم ہی رہو گے۔ مومن نہیں بن سکو گے

نفسیاتی تبدیلی

اسلامی نظام درحقیقت اس تبدیلی سے قائم ہوتا ہے جو جماعتِ مومنین کے قلب میں پیدا ہوتی ہے۔ اس قسم کی نفسیاتی تبدیلی کے بغیر، نظامِ خداوندی متشکل ہی نہیں ہو سکتا۔ إِنَّ اللَّهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتَّىٰ يُغَيِّرُوا مَا بِأَنفُسِهِمْ ‎(۱۳/۱۱) — یعنی خدا کسی قوم کی حالت میں تبدیلی نہیں کرتا جب تک اس قوم کے اندر نفسیاتی تبدیلی نہ پیدا ہو جائے — یہ ایسی سنت اللہ (خدا کا اٹل قانون) ہے جس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا۔ جماعتِ مومنین، اسی نفسیاتی تبدیلی کا مظہر ہوتی ہے اور یہ تبدیلی پیدا ہوتی ہے اس قرآن کے مطابق زندگی بسر کرنے سے جس کی خصوصیت یہ ہے کہ ؎

چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود

جاں چوں دیگر شد جہاں دیگر شود

اس حقیقت کو ایک بار پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بات قرآن کریم کی صحیح تعلیم اور اس کے مطابق تربیت سے پیدا ہوتی ہے ایک چیز ہے اسلام کی دعوت کا فکری طور پر سمجھنا اور اس طرح ذہنی طور پر اس کی صداقت کا معترف ہو جانا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کے دماغ میں اس دعوت کے متعلق شکوک و شبہات پیدا نہیں ہوتے اور اس کے خلاف منطقی دلائل اور فلسفیانہ اعتراضات اسے ڈگمگا نہیں دیتے۔ لیکن ایمان کا مظاہرہ اس وقت ہوتا ہے جب اس دعوت کے کسی تقاضے (یعنی مستقل قدر) اور انسان کی طبیعی زندگی کے کسی تقاضے میں (خواہ وہ محض جذباتی بات ہو یا مخصوص مفاد کا سوال)، تصادم ہو اور وہ طبیعی زندگی کے تقاضے پر، مستقل قدر کے تقاضے کو ترجیح دے۔ یہ ہے وہ ایمان جو دل کی گہرائیوں میں جاگزیں ہوتا ہے۔ اسی کے حاملین کو مومن کہتے ہیں جن کے متعلق خدا کا ارشاد ہے کہ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ‎(۲/۱۵۷)۔

میں اس حقیقت کو پھر دہرا دینا چاہتا ہوں کہ میں نے جو کچھ ابھی ابھی کہا ہے اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ قرآنِ کریم نے مومن اور مسلم میں مستقل طور پر یہ تفریق کی ہے۔ بالکل نہیں۔ اس نے مومن اور مسلم کے الفاظ مرادف معنوں میں بھی استعمال کئے ہیں اور مومنوں کی عظیم ترین شخصیتوں — حتیٰ کہ حضرات انبیاء کرام منجملہ نبی اکرمؐ — کو مسلم کہہ کر پکارا ہے۔ اس نے فرق یہ بتایا ہے کہ جو لوگ کسی مصلحت کی خاطر مسلمانوں کی جماعت میں شامل ہو

جائیں یا محض مسلمانوں کے گھر پیدا ہو جانے سے مسلمان کہلائیں۔ انہیں اپنے آپ کو مومن نہیں کہنا چاہیئے تاآنکہ ایمان ان کے دل کی گہرائیوں میں پیوست نہ ہو جائے۔ ورنہ، عام معنوں میں، مومن اور مسلم دونوں ہیں مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ (۲/۱۱۲)۔ جنہوں نے اپنی تمام خواہشات اور توجہات کو قوانینِ خداوندی کے تابع رکھا اور اس طرح نہایت متوازن زندگی بسر کی۔ سو اس کے اعمال کا اجر اس کے نشوونما دینے والے کے پاس ہے۔ اور اس کا عملی ثبوت یہ ہے کہ انہیں نہ کسی قسم کا خوف ہوگا نہ حزن۔ لہٰذا، مومن اور مسلم وہ ہے جسے نہ خارج سے کسی قسم کے خطرہ کا خوف ہو اور نہ داخلی طور پر اس کے دل میں یاس و حزن کا گزر ہو یہ ہے مقامِ مومن اور انداز مسلم۔ علامہ اقبالؒ کے الفاظ ہیں

ہر لحظہ ہے مومن کی نئی شان نئی آن — گفتار میں، کردار میں اللہ کی برہان
قہاری و غفاری و قدوسی و جبروت — یہ چار عناصر ہوں تو بنتا ہے مسلمان
قدرت کے مقاصد کا عیار اس کے ارادے — دنیا میں بھی میزان قیامت میں بھی میزان
جس سے جگر لالہ میں ٹھنڈک ہو وہ شبنم
دریاؤں کے دل جس سے دہل جائیں وہ طوفان
(ضربِ کلیم)

قرآنی قوانین

للہ الحمد کہ پرویز صاحب کی تازہ ترین تصنیف —— قرآنی قوانین ——
ملک میں بے حد مقبول ہو رہی ہے اور اس کی افادیت نکھر کر سامنے آ رہی ہے۔
اس سے نظر آتا ہے کہ اس کا پہلا ایڈیشن جلد ختم ہو جائے گا۔ اگر آپ نے
اسے ابھی تک حاصل نہیں کیا تو جلدی منگوا لیجیئے۔

قیمت فی جلد (مجلد) بیس/- روپے (علاوہ محصولڈاک)

ناظم ادارۂ طلوعِ اسلام۔ گلبرگ ۲۔ لاہور

مطالبُ الفرقان

جلد سوم

مفکرِ قرآن جناب **پرویز** نے اپنی زندگی قرآنِ کریم کی فکر اور تعلیم کی نشر و اشاعت کے لئے وقف کر رکھی ہے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے پہلے لغات القرآن شائع کی۔ پھر اس کی روشنی میں پورے کے پورے قرآن مجید کا مفہوم، مفہوم القرآن کے نام سے شائع کیا۔ پھر تین ضخیم جلدوں میں قرآنی انسائیکلو پیڈیا (تبویب القرآن) مرتب کیا۔ اور اس کے بعد اس تمام تحقیق کی روشنی میں قرآن مجید کی مسلسل تفسیر کا سلسلہ مطالب الفرقان کے نام سے شروع کیا۔ اس کی پہلی جلد سنہ ۱۹۷۵ء میں شائع ہوئی تھی اور مشتمل تھی سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کی ابتدائی ۲۹ آیات پر۔ دوسری جلد جو سورۃ بقرہ کی آیات ۳۰ تا ۱۱۲ پر مشتمل تھی سنہ ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ اب اس سلسلہ کی تیسری جلد شائع ہوئی ہے جس میں سورۃ بقرہ اختتام پذیر ہو گئی ہے۔ کتاب میں قرآنی تعلیم و حقائق کے کون کون سے موضوع آ گئے ہیں اس کا اندازہ تو اس کے مطالعہ ہی سے لگ سکے گا۔ ذیل میں اس کے ابواب کے عنوانات دیئے جاتے ہیں:

(۱) الدّین کے بنیادی اصول (۲) معمارِ حرم (۳) مرکزِ ملّت (کعبہ)۔ (۴) زندگی و حیات۔ (۵) بیّنات اور کتاب (۶) آل ورلڈ مسلم کانفرنس۔ (۷) درونِ خانہ (عائلی زندگی)۔ اور (۸) قرآنی نظام کے ابتدائی مراحل

آخر میں تینوں جلدوں کے مضامین کا ایک جامع انڈکس دیا گیا ہے۔ کہنے کو تو یہ سورۃ فاتحہ اور سورۃ بقرہ کے مضامین کا انڈکس ہے لیکن اس میں اسلام کا پورا نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔

کتاب ولایتی سفید کاغذ پر آفسٹ کی اعلیٰ درجہ چھپائی میں چھپی ہے۔ ضخامت (پہلی جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی) ۴۳۵ صفحات۔ جلد مضبوط بھی اور دلکش بھی۔ قیمت -/۵۵ روپے فی جلد۔ خرچ ڈاک -/۵ روپے

حسبِ معمول پیشگی خریداروں کو کتاب بلا فرمائش بھیج دی جائے گی۔ لیکن اگر کوئی صاحب کتاب نہ منگانا چاہیں تو اس کے متعلق ۱۵ جنوری تک ادارہ کو مطلع فرما دیں۔

کتاب ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش۔ چوک اردو بازار لاہور (۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

قرآنی فیصلے

(جلد چہارم)

طلوع اسلام کی مسلسل کاوشں اور کوشش کا نتیجہ تھا کہ افراد ملت نے اسلام کے متعلق غور و فکر سے کام لینا شروع کیا۔ اس کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ ان کے دل میں مختلف قسم کے شکوک پیدا ہوئے اور اعتراضات ابھرنے لگے۔ یہ شکوک و اعتراض بیشتر اس اسلام کے پیدا کردہ تھے جو ہمارے قدامت پرست طبقہ کی طرف سے پیش کیا جاتا ہے۔ یا اس تعلیم کے پیدا کردہ جو ہمارے سکولوں اور کالجوں میں دی جاتی ہے۔ طلوع اسلام نے اپنا فریضہ سمجھا کہ وہ ان شکوک کا ازالہ کرے اور ان اعتراضات کا جواب دے۔ چنانچہ طلوع اسلام کے پاس یہ سوالات آتے گئے اور یہ ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ سوال و جواب کا یہ سلسلہ اس قدر اہم تھا کہ ارباب فکر و نظر کے تقاضے کے پیش نظر اسے الگ کتابی شکل میں شائع کرنا ضروری سمجھا گیا۔

اس نہایت اہم اور مقبول سلسلہ کا نام ہے

قرآنی فیصلے

جس کی تین جلدیں پہلے شائع ہو چکی تھیں اور چوتھی جلد اب شائع ہوئی ہے۔ اس میں سینکڑوں سوالات اور ان کے اطمینان بخش جوابات آ گئے ہیں۔ تفصیل میں جانے کی تو گنجائش نہیں۔ اس کے ان ابواب پر ایک نگاہ ڈالئے۔

(۱) قرآن مجید (۲) نبوت، رسالت، احادیث (۳) ہماری تاریخ (۴) تقدیر
(۵) تصوف (۶) علوم سائنس (۷) عائلی زندگی (۸) فرقہ بندی

ہر باب کے تحت بکثرت سوالات اور ان کے جوابات دیئے گئے ہیں۔ ضخامت پہلی تین جلدوں کے مقابلہ میں زیادہ یعنی) ۴۲۴ صفحات۔ قیمت -/۱۵ روپے۔

(سابقہ جلدوں کی قیمت۔ جلد اوّل -/۱۰ روپے۔ جلد دوم -/۱۰ روپے۔ جلد سوم -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش، چوک اردو بازار لاہور ● (۲) ادارہ طلوع اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

طاہرہ کے نام خطوط

پرویز صاحب کے خطوط کا سلسلہ ہماری تعلیم یافتہ نئی نسل میں بڑا مقبول ہوا ہے اور ان کے قلب و دماغ میں جو صحیح انقلاب آیا ہے اس کا بیشتر انہی خطوط کا رہینِ منت ہے۔ سلیم کے نام خطوط (تین جلدوں میں) نوجوان طلباء کے نام ہیں اور طاہرہ کے نام، طالبات کے لئے جس میں بالخصوص عورتوں سے متعلق مباحث کو قرآن مجید اور علوم حاضرہ کی روشنی میں سلجھایا گیا ہے۔ یہ سلسلہ خواتین کے حلقہ میں بڑی پسندیدگی کی نگاہ سے دیکھا گیا ہے اور انہوں نے اسے بڑا مفید پایا ہے۔ اس کا پہلا ایڈیشن ختم ہوا تو اس کی طلب شدت سے بڑھ گئی۔ چنانچہ اب اس کا تازہ ایڈیشن چھپ کر آ گیا ہے۔

قیمت -/۱۰ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

اسلامی معاشرت

پرویز صاحب کی اس عام فہم کتاب میں زندگی کے روزمرہ کے امور کے متعلق قرآنی احکام ایسے سلیس اور دلکش انداز میں دیئے گئے ہیں کہ اس سے بچے اور کم تعلیم یافتہ لوگ بڑی آسانی سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ اس کی مقبولیت کا اندازہ اس سے لگائیے کہ اس کے یکے بعد دیگرے متعدد ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔ سابقہ ایڈیشن کچھ عرصہ ہوا ختم ہو گیا تھا۔ اب اس کا تازہ ایڈیشن شائع ہو گیا ہے۔

قیمت -/۶ روپے علاوہ محصول ڈاک۔

ملنے کا پتہ

(۱) مکتبہ دین و دانش چوک اردو بازار لاہور

(۲) ادارہ طلوعِ اسلام ۲۵ بی گلبرگ ۲۔ لاہور

علامہ اقبالؒ کا پیغامِ نوروز

علامہ اقبالؒ نے اپنی وفات سے چند ماہ قبل، یکم جنوری ۱۹۳۸ء کو (سالِ نو کے آغاز کی تقریب پر) اقوامِ عالم کے نام، آل انڈیا ریڈیو، لاہور سے ایک پیغام نشر کیا تھا جس میں بتایا تھا کہ عالمِ انسانیت کرب و اذیت کے جس برزخ میں گرفتار، اور تباہی و بربادی کے جس جہنم کی طرف کشاں کشاں چلا جا رہا ہے، اس کے حقیقی وجوہ و اسباب کیا ہیں اور اس سے نجات حاصل کرنے کی صورت کیا۔ اس پیغام کا اُردو ترجمہ طلوعِ اسلام کی اشاعت بابت جنوری ۱۹۴۱ء میں شائع ہوا تھا۔ اب اسے دوبارہ شائع کیا جاتا ہے۔ اس حقیقت کی وضاحت کے لئے کہ حضرت علامہؒ نے جن اسباب و علل کی نشاندہی چالیس اکتالیس سال پہلے کی تھی، واقعات اور حوادثِ عالم نے ان میں سے ایک ایک کی کس طرح تصدیق کر دی ہے۔ اس قسم کی فراست صرف اس "دانشِ نورانی" (قرآنِ حکیم) سے پیدا ہو سکتی ہے جس سے اُن کی نگہ بصیرت مستنیر تھی۔

پیغامِ اقبالؒ

عصرِ حاضر نے علومِ عقلیہ اور دنیائے سائنس میں جو بے مثال ترقی کی ہے اس پر اُسے بڑا ناز ہے۔ اور اس کا یہ فخر و ناز بلاشبہ حق بجانب ہے۔ آج زمان و مکان کی وسعتیں سمٹ بلکہ مٹ رہی ہیں اور وہ فطرۃ کے اسرار و رموز کی نقاب کشائی اور اس کی قوتوں کو مسخر کر کے انہیں اپنے استعمال میں لانے کے سلسلہ میں حیرت انگیز کامیابیاں حاصل کر رہا ہے لیکن ان تمام ترقیوں کے باوجود، اس زمانے میں استعمار کے جبر و استبداد نے، جمہوریت، نیشنلزم، کمیونزم، فسطائیت اور نہ معلوم اور کون کون سے نقاب اوڑھ کر ساری دنیا میں اپنے جال پھیلا رکھے ہیں۔ ان نقابوں کے پردے میں دنیا کے تمام گوشوں میں، روحِ حریت اور شرفِ انسانیت کو جس بے دردی سے پامال کیا جا رہا ہے اس کی مثال تاریخِ عالم کا تاریک سے تاریک تر دور بھی پیش نہیں کر سکتا۔ جن نام نہاد مدبرین (سیاست دانوں) کو انسانوں کی قیادت اور اقتدارِ حکومت کے فرائض سونپے گئے تھے، وہ استبداد، خون ریزی اور زیر دستوں کی پامالی کے جنّات ثابت ہوئے ہیں۔ جن اربابِ حکومت کا فریضہ یہ تھا کہ وہ ان نظریاتِ حیات کی حفاظت کریں جن

سے ارفع و اعلیٰ انسانیت صورت پذیر ہوتی ہے۔ جن کی ذمہ داری یہ تھی کہ وہ دیکھیں کہ کوئی بالادست، کسی کمزور انسان پر ظلم و تعدی نہ کر سکے، اور اس طرح وہ نوعِ انسان کی اخلاقی و ذہنی سطح بلند کریں۔ انہوں نے ہوسِ اقتدار کے غلبہ اور کمزور قوتوں کے ممالک پر قبضہ کرنے کے جنون میں، کروڑوں بندگانِ خدا کو ہلاک کر دیا اور کروڑوں کو غلامی اور محکومی کی زنجیروں میں جکڑ دیا۔ محض اس لئے کہ ان کے اپنے گروہ کی خون آشامی کی تسکین کا سامان فراہم ہو جائے۔ انہوں نے کمزور اقوام پر تسلط اور تغلب حاصل کرنے کے بعد، انہیں ان کے معتقدات، ان کے مذہب، ان کی اخلاقی اور ثقافتی روایات اور ادب سے بیگانہ بنا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے ان میں باہمی تفرقہ کے ایسے بیج بو دیئے جن سے وہ ایک دوسرے کا خون بہانے لگ گئے۔ یہ سب اس لئے کہ وہ غلامی اور محکومی کی افیون سے مدہوش ہو جائیں اور استعمار کی جونکیں چپ چاپ ان کا خون چوستی رہیں۔

آج جب میں سالِ گذشتہ پر نگہ بازگشت ڈالتا ہوں اور اس دنیا کو دیکھتا ہوں جو سالِ نو کے جشن منانے میں مشغول ہے ——— وہ ایبے سینیا ہو یا فلسطین، ہسپانیہ ہو یا چین۔ اس خاکدان کے گوشے گوشے میں وہی قیامت برپا ہے اور لاکھوں انسان نہایت بے دردی سے ذبح کئے جا رہے ہیں۔ سائنس نے تباہی اور بربادی کے جو مہیب آلات ایجاد کئے ہیں ان کی مدد سے انسانی تمدن کے آثار تک مٹائے جا رہے ہیں؛ جو حکومتیں خوں ریزی اور آتش افروزی کے ان ڈراموں میں سرِ دست شریک نہیں وہ اقتصادی اسکیموں کے ذریعے کمزور قوموں کے خون کا آخری قطرہ تک چوس رہی ہیں۔ ایسا نظر آتا ہے کہ دنیا میں حشر برپا ہے جس میں ہر ایک اپنی اپنی جان بچانے کی فکر میں غلطاں و پیچاں ہے اور انسانی ہمدردی اور اخوت کی کوئی آواز کہیں سے سنائی نہیں دیتی۔ مفکرینِ عالم دم بخود ہیں اور پوچھ رہے ہیں کہ کیا تہذیب و تمدن کے اس عروج اور انسانی ترقی کے اس کمال کا انجام یہی ہونا تھا کہ انسان ایک دوسرے کا گلا کاٹنے لگ جائیں۔ نفرت عام ہو جائے اور کرۂ ارض پر انسانی زندگی کا قیام ممکن نہ رہے!

یاد رکھئے! صفحۂ ہستی پر انسان کی بقا کا راز احترامِ آدمیت میں پوشیدہ ہے۔ جب تک دنیا کی تمام تعلیمی قوتیں اپنی توجہات انسانوں کے دل میں احترامِ آدمیت پیدا کرنے کے نقطہ پر مرکوز نہ کر دیں، یہ دنیا خونخوار درندوں کا میدانِ کارزار بنی رہے گی۔ کیا آپ نے دیکھا کہ ہسپانیہ کے باشندے، ایک نسل، ایک زبان، ایک قومیت، ایک مذہب کے باوجود، محض اقتصادی نظریہ کے اختلاف کی بنیاد پر ایک دوسرے کا گلا کاٹ رہے ہیں؟ یہ ایک واقعہ اس حقیقت کا غماز ہے کہ محض قومی وحدت بھی قیام اور بقا کی ضامن نہیں ہو سکتی۔ وحدت ایک ہی قابلِ اعتماد ہے اور وہ ہے نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کی وحدت جو نسل، قومیت، رنگ اور زبان سے بالاتر ہے۔ جب تک اس نام نہاد جمہوریت، اس طفلانہ قوم پرستی اور اس قابلِ نفرت استعماریت کو پاش پاش نہ کر دیا جائے۔ جب تک انسان عملاً یہ ثابت نہ کر دے کہ وہ اس حقیقت پر ایمان رکھتا ہے "کہ مخلوق ساری ہے کنبہ خدا کا"۔ جب تک جغرافیائی وطنیت اور رنگ نسل کا امتیاز کالعدم نہ ہو جائے، انسان دنیا میں اطمینان اور مسرت کی زندگی بسر نہیں کر سکے گا، نہ ہی حریت، مساوات اور اخوت کے حسین الفاظ شرمندۂ تعبیر ہو سکیں گے۔

اس بنا پر آیئے ہم اس سالِ نو کا آغاز اس دعا سے کریں کہ خدائے بزرگ و برتر اربابِ اقتدار و اعلیٰ حکومت کو انسان بنائے اور انہیں نوعِ انسان کی عالمگیر برادری کے تصور سے سرشار ہونے کی تعلیم دے۔

———(۰)———

علّتِ مرض ـــــ اور اُس کا عِلاج

ظَهَرَ الْفَسَادُ فِي الْبَرِّ وَالْبَحْرِ بِمَا كَسَبَتْ أَيْدِي النَّاسِ (۳۰/۴۱)

انسانوں کے خودساختہ نظامِ زندگی کا نتیجہ ہے کہ ساری دنیا میں تباہیاں مچ رہی ہیں۔

کہتے ہیں کہ انسان کی تمدنی زندگی کا آغاز آج سے قریب چھ ہزار سال پہلے ہوا۔ اربابِ علم و تحقیق، انسانی تاریخ کے اس چھ ہزار سالہ دَور کے متعلق جو کچھ کھوج لگا سکے ہیں، اس سے وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ اگرچہ اس کی تاریخ، خوں ریزیوں اور فساد انگیزیوں کی ایک مسلسل داستان ہے، لیکن جس انداز کی تباہی موجودہ زمانے میں رونما ہو رہی ہے، اس کی مثال اس سے پہلے کہیں نہیں ملتی۔ اس سے پہلے جو تباہیاں آتی تھیں، ایک تو وہ کسی خاص خطۂ زمین تک محدود ہوتی تھی، اور دوسرے ان کے نتائج و عواقب اتنے دُوررس نہیں ہوتے تھے۔ عصرِ حاضر میں، وسائلِ رسل و رسائل کی وسعت و کثرت کا نتیجہ ہے کہ جو آگ کسی ایک خطۂ زمین میں بھڑکتی ہے، اس کے شعلے (بالواسطہ یا بلاواسطہ) پورے کے پورے کرۂ ارض کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں ـــــ اور اب تو شاید یہ شعلے اجرامِ فلکی تک کو بھی محیط ہو جایا کریں گے ـــــ دوسری طرف، ان شعلہ خیزیوں اور شررباریوں کے انجام و عواقب وقتی اور ہنگامی نہیں ہوتے، یہ آنے والی نسلوں تک مسلسل پھیلتے چلے جاتے ہیں۔ وہ مکان فراموش اور زمان ناآشنا تباہیاں جن کا نقشہ قرآنِ کریم نے اس آیۂ جلیلہ کے چار الفاظ میں نہایت جامعیت سے کھینچ کر رکھ دیا ہے جو زیبِ عنوان ہے۔

جو اربابِ علم و بصیرت، انسانیت کا درد اپنے دل میں رکھتے ہیں، وہ اس صورتِ حال سے انتہائی دل گرفتہ اور آہ بلب رہتے ہیں اور ان تباہیوں کے اسباب و علل دریافت کرنے کے لئے مصروفِ تحقیق و تدقیق۔ لیکن ان کی اس تمام سعی و کاوش کی کیفیت یہ ہے کہ وہ آج جس نتیجہ پر پہنچتے ہیں ـــــ اور اُس کا علاج اس طرح سے کرتے ہیں گویا انہوں نے اس فردوسِ گم گشتہ کا سراغ پا لیا ہے جس کی تلاش میں، جنّت سے نکالا ہوا ابنِ آدم، مارے مارے پھر رہا ہے ـــــ لیکن ہنوز اس جشنِ مسرّت کی شبِ چراغاں کی سحر بھی نہیں ہونے پاتی کہ اس تشخیص و تدبیر کے نتائج اس کی ناکامی کے ماتم گسار بن جاتے ہیں۔ کبھی کہا جاتا ہے کہ اس کی وجہ وہ سیاسی

نظام ہے جس سے قوموں کے مفاد ایک دوسرے سے ٹکراتے اور باہمی آویزشوں کا موجب بنتے رہتے ہیں۔ کہیں یہ کہا جاتا ہے کہ اس کا باعث وہ معاشی نظام ہے جس سے طبقات وجود میں آتے ہیں اور طبقاتی نزاع ان کے باہمی تصادمات کا موجب بنتی ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اس کی وجہ حکومتوں کی انتظامی مشینری کی کمزوری ہے جس سے لاقانونیت کی روک تھام نہیں ہوتی اور کوئی اسے نظامِ تعلیم و تربیت کی خرابی پر محمول کرتا ہے جس سے نوجوانوں میں جنسی بے راہ روی اور سرکشی و قانون شکنی کے رجحانات عام ہوتے چلے جاتے ہیں۔ سطحی نگاہ سے دیکھئے تو یہ اسباب، موجودہ بے راہ روی اور عالمگیر تباہیوں کے بڑے موثر عوامل دکھائی دیں گے۔ لیکن سطح سے ذرا نیچے اتر کر دیکھئے تو یہ اسباب، صرف علامات مرض ثابت ہوں گے، علتِ مرض نہیں ——— اور علتِ مرض تک یہ دیدہ ور پہنچ نہیں رہے۔ اس کی وجہ ذرا آگے چل کر سامنے آئے گی۔

قرآن کریم، علاماتِ مرض سے بحث نہیں کرتا، وہ علتِ مرض کی نشاندہی کرتا ہے جب کہتا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (۱۳/۱۱) یعنی قوموں کی زندگی کی عمارت اس کے نظریۂ حیات کی بنیادوں پر استوار ہوتی ہے۔ جو اس میں نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتا ہے۔ جس قسم کا نظریۂ حیات اسی قسم کی نفسیاتی تبدیلی اور جس قسم کی نفسیاتی تبدیلی اسی قسم کے خارجی نتائج۔ اسباب و علل کی ان کڑیوں کی رُو سے غلط نظریۂ حیات کا لازمی نتیجہ تباہیاں (و بربادیاں) ہوتا ہے اور صحیح نظریۂ حیات کے فطری برگ و بار کی سرفرازیاں اور خوشگواریاں۔ قرآن کریم کی اس تشخیص کی رُو سے، عصرِ حاضر کی تباہیوں کی بنیادی اور اساسی وجہ وہ نظریۂ حیات ہے جس نے اس وقت عالم گیر حیثیت اختیار کر رکھی ہے۔

یہ نظریۂ حیات کیا ہے؟ یہ کہ انسانی زندگی دیگر حیوانات کی طرح، محض طبیعی زندگی (PHYSICAL LIFE) ہے۔ انسان، طبیعی قوانین کے مطابق، حیوانات کی طرح، کھاتا، پیتا، افزائش نسل کرتا اور اس کے بعد مر جاتا ہے۔ اور جب وہ مر جاتا ہے تو وہ ختم ہو جاتا ہے۔ قرآن کے الفاظ میں وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (۴۷/۱۲) یہ لوگ، جو حیوانی زندگی سے بلند زندگی کے قائل نہیں۔ ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ حیوانات کی طرح کھاتے پیتے (اور بالآخر مر جاتے ہیں) دوسری جگہ قرآن کریم نے کہا ہے کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ (۷/۱۷۹) یہ لوگ حیوانات کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔ یہ بَلْ هُمْ اَضَلُّ — ایک گہری حقیقت کا ترجمان ہے۔ حیوانات پر فطرت نے خود پابندیاں عائد کر رکھی ہیں۔ جنہیں ان کی جبلت کہا جاتا۔ اور حیوانات کو اس کا اختیار نہیں ہوتا کہ وہ ان پابندیوں کو توڑ سکیں۔ لیکن انسان پر فطرت نے کوئی کنٹرول نہیں رکھا۔ دوسری طرف اس کی قوتیں بھی لاانتہا ہیں۔ اب آپ کسی ایسے حیوان کا تصور ذہن میں لائیے جسے لامحدود قوتیں حاصل ہوں اور ان قوتوں کو وہ جس طرح جی چاہے استعمال کرے۔ اس پر اس باب میں فطرت کی طرف سے کوئی پابندی عائد نہ ہو۔ نیز، وہ حیوان کسی جنگل میں اکیلا نہ ہو ——— اس قسم کے بہت سے ——— ہزاروں، لاکھوں، کروڑوں حیوان ہوں اور ان سب نے اکٹھے رہنا ہو۔ اس کے بعد آپ سوچئے کہ اس کا نتیجہ خون ریزیاں اور فساد انگیزیاں نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا!

انسانی قوت کے استعمال پر پابندیاں، سوسائٹی کی طرف سے عائد ہوتی ہیں اور "سوسائٹی" خود انہی افراد کے مجموعہ کا نام ہوتا ہے۔ اسے بالفاظِ دیگر یوں سمجھئے کہ۔۔۔ انسان خود مل بیٹھ کر طے کرتے ہیں کہ ہمیں کس قسم کی پابندیوں کے تابع زندگی بسر کرنی چاہیئے۔ اس مقصد کے لئے، کہ یہ انسان ان پابندیوں کو ملحوظ رکھیں۔ یہ بھی طے کر لیا جاتا ہے کہ ان میں سے جو شخص ان پابندیوں کو توڑے گا، اسے یہ سزا ملے گی۔ اسے سوسائٹی کا قانونِ عدل کہا جاتا ہے۔ اس قانونِ عدل کو بروئے کار لانے کے لئے سوسائٹی ایک مشینری وضع کرتی ہے جسے انتظامیہ (پولیس وغیرہ) کہا جاتا ہے۔ اس انتظامیہ کے لئے یہ ممکن نہیں ہوتا کہ وہ معاشرہ کے ایک ایک فرد کے سر پر ایک ایک نگران مقرر کر دے جو ہر وقت دیکھتا رہے کہ وہ، ان قوانین کی پابندی کرتا ہے کہ نہیں۔ یہ اس انتظام کا پہلا نقص ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جو قانون شکنی انتظامیہ کی نگاہوں سے اوجھل رہے، اس پر کسی قسم کی گرفت نہیں ہو سکتی۔ عقلِ حیلہ گر انسان کو سینکڑوں ایسی تدابیر سجھا دیتی ہے جن سے اس کی قانون شکنی کسی کی گرفت میں نہ آسکے۔

اس انتظام کا دوسرا نقص یہ ہے کہ خود انتظامیہ کی مشینری بھی انہی جیسے انسانوں پر مشتمل ہوتی ہے۔ جو اپنے مفاد کی خاطر، قانون شکنی سے تسامح برتنے یا ان سے تعاون کرنے لگ جاتے ہیں۔ ایسی صورت میں قانون شکنی عام ہو جاتی ہے ——— اتنی عام کہ اس کی روک تھام سوسائٹی کے بس میں نہیں رہتی اور اس کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ خود اس قانون ہی کو منسوخ قرار دے دے۔ سوسائٹی کی اس بے بسی سے قانون کا احترام ہی باقی نہیں رہتا۔

یہ تو رہی پابندیوں کی عدمِ پابندی۔ جہاں تک حسنِ اخلاق کا تعلق ہے، اس نظریۂ زندگی کی رُو سے، اس کے لئے کوئی جذبۂ محرکہ ہی نہیں ہوتا۔ مثلاً قانون کی رُو سے آپ لوگوں کو اس کے تو پابند کر سکتے ہیں کہ وہ کسی کے اِں چوری نہ کریں۔ لیکن دنیا کا کوئی قانون انہیں اس بات پر مجبور نہیں کر سکتا کہ وہ کسی محتاج کی امداد کریں۔ اس کا تعلق حسنِ اخلاق سے ہے۔ اور طبیعی نظریۂ زندگی کی رُو سے، کوئی شخص اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا کہ میں کسی محتاج کی مدد کیوں کروں؟ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ تم محتاج کی مدد اس لئے کرو کہ اگر کل کو تم محتاج ہو جاؤ، تو دوسرا تمہاری مدد کرے۔ لیکن یہ جواب جس قدر بودا اور یہ جذبہ جس قدر کمزور ہے، وہ ظاہر ہے۔ اگر ایک شخص اس کا انتظام کر لے کہ اسے کسی کی امداد کی ضرورت ہی نہ پڑے تو اس کے لئے یہ دلیل بے بنیاد ہو جاتی ہے۔ دراصل، یہ دلیل حسنِ سلوک کے لئے جذبۂ محرکہ نہیں بلکہ کاروباری ذہنیت پیدا کرنے کا موجب بن سکتی ہے ——— یعنی میں کسی کو کچھ دوں تاکہ کل کو عند الضرورت وہ مجھے کچھ دے۔ یہ خالصتہً بزنس ہے۔ یہ تو رہا ایک قوم کے اندر افراد کا باہمی معاملہ ——— جہاں تک اقوام کا باہمی معاملہ ہے حیوانی نظریۂ زندگی کی رُو سے، کوئی عوامل ایسے مؤثر نہیں ہو سکتے جو کسی بالادست قوم کو کمزور قوم پر دست درازی کرنے سے روک سکیں۔ اقوامِ عالم نے بین الاقوامی امور کے تصفیہ کے لئے پہلے لیگ آف نیشنز کی طرح ڈالی تھی اور اس کی ناکامی کے بعد اب اقوامِ متحدہ کی تشکیل کر رکھی ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ وہاں بھی بالادست قوتوں کی کارفرمائی ہے۔ زیردستوں کی کچھ شنوائی نہیں ہوتی۔ اور یہ کوئی تعجب انگیز بات نہیں۔ حیوانی نظریۂ زندگی میں "جنگل کے قانون" سے برتر کوئی قانون ہو نہیں سکتا۔ اور جنگل کا قانون یہی ہے کہ ہر زیردست، بالادست کا شکار ہوتا ہے۔

اب آپ نے غور فرمالیا کہ اس وقت عالم گیر تباہیوں نے جس بری طرح سے نوعِ انسان کو گھیر رکھا ہے، اس کی بنیادی وجہ کیا ہے؟ اس کی بنیادی وجہ ہے حیوانی نظریۂ زندگی ۔ اسی کو مادی نظریۂ حیات یا (MATERIALISTIC CONCEPT OF LIFE) کہتے ہیں۔ یہ نظریہ یوں تو قدیم ایام سے چلا آرہا تھا، لیکن انیسویں صدی عیسوی میں اس نے یورپ میں نمایاں شہرت حاصل کی اور اس کے بعد رفتہ رفتہ اس نے ساری دنیا کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ جو مذہب پرست طبقہ، زبانی اس نظریہ کی مخالفت کرتا ہے، عملاً وہ بھی اسی کا پیرو ہے۔ ان کی وجہ اختصاص چند مذہبی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اکبرؔ کے الفاظ میں ؎

شیخ صاحب وہی کرتے ہیں جو سب کرتے ہیں
یہ الگ بات ہے، ہم ان کا ادب کرتے ہیں

———(۰)———

اس کے برعکس، قرآن کریم انسانی زندگی کا ایک اور نظریہ پیش کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ انسان کی زندگی محض طبیعی زندگی نہیں۔ اس کے اندر ایک اور شے بھی ہے جسے انسانی ذات کہا جاتا ہے۔ وہ نہ طبیعی قوانین کی پیدا کردہ ہے، نہ طبیعی قوانین کے تابع۔ اور نہ ہی انسان کی طبیعی زندگی کے ختم ہو جانے کے ساتھ (جسے موت کہا جاتا ہے) اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ وہ اس کے بعد بھی زندہ رہتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کی اصطلاح سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسانی جسم کی نشو و نما یا اضمحلال و انحطاط طبیعی قوانین کے مطابق ہوتا ہے۔ لیکن ذات کی نشو و نما یا ضعف و انحطاط، مستقل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے۔ مثلاً انسان اگر اچھی غذا کھاتا ہے تو اس سے اس کے جسم کی عمدہ پرورش ہوتی ہے۔ لیکن اگر وہ غذا، ناجائز دولت سے حاصل کردہ ہوتی ہے تو اس سے اس کی ذات کمزور ہو جاتی ہے۔ اسی طرح، انسان کے ہر عمل کا اثر اس کی ذات پر پڑتا ہے۔ اس کا جو عمل اقدارِ خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اس سے اس کی ذات کی نشو و نما ہوتی ہے جو اس کے خلاف ہوتا ہے، اس سے اس کی ذات میں ضعف اور انتشار واقع ہو جاتا ہے۔ انسانی اعمال کے اثرات اس کی ذات پر از خود مرتب ہوتے رہتے ہیں۔ اس کے لئے کسی خارجی مشینری کی ضرورت نہیں ہوتی۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ انسانی اعمال اور ان کے اثرات کو تین شقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ ایسے اعمال جن کا اثر طبیعی ہوتا ہے، اور وہ محدود ہوتا ہے فردِ متعلقہ کے جسم تک۔ مثلاً ایک شخص افیون کھاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس سے اس کی اپنی طبیعی قوتیں مضمحل اور افسردہ ہو جائیں گی۔ کسی دوسرے پر اس کا اثر نہیں پڑے گا۔

۲۔ ایسے اعمال جن کا اثر معاشرہ پر پڑتا ہے۔ مثلاً ایک شخص چوری کرتا ہے۔ اس کے اس عمل کا اثر معاشرہ کے دیگر افراد پر پڑتا ہے۔ اس کی روک تھام کے لئے معاشرہ قوانین مرتب کرتا ہے اور ان قوانین کی خلاف ورزی کرنے والوں کو سزا دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ایسے اعمال کا ایک اور پہلو بھی ہے۔ چونکہ چوری کرنا (یا دوسروں کا مال باطل طریق سے حاصل کرنا) ایک مستقل قدر کی خلاف ورزی بھی ہے، اس لئے اس کا اثر انسان کی ذات پر بھی مرتب ہوتا ہے۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَمَنْ یَّکْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا

يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ - (۴/۱۱۱) جو شخص کوئی جرم کرتا ہے تو (ہرچند وہ جرم معاشرہ کے کسی قانون کے خلاف ہوگا۔ اور اس کا نقصان کسی دوسرے فرد کو ہوگا۔ لیکن) درحقیقت، مجرم وہ جرم خود اپنی ذات کے خلاف کرتا ہے۔ اس جرم کے سلسلہ میں وہ معاشرہ کی عدالتی مشینری کی گرفت میں آتا ہے یا نہیں اور اسے وہاں سے سزا ملتی ہے یا نہیں، اس کا تعلق معاشرہ سے ہے۔ لیکن اس کا مضر اثر اس کی ذات پر بہرحال پڑتا ہے۔ اس سے وہ بچ نہیں سکتا۔

۳- تیسری شق ایسے اعمال پر مشتمل ہے جن کا نہ تو کوئی طبیعی اثر انسان کے جسم پر مرتب ہوتا ہے (جس طرح شق اوّل میں بیان کیا گیا ہے) اور نہ ہی معاشرہ پر (جیسے شق دوم میں کہا گیا ہے) ان کا اثر صرف فرد متعلقہ کی ذات پر مرتب ہوتا ہے۔ مثلاً ایک شخص کسی کی کوئی چیز چرانے کی نیت کرتا ہے۔ لیکن نہ اسے چراتا ہے اور نہ ہی اسے چرانے کے لئے کوئی عملی اقدام کر پاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کی اس نیت اور ارادہ کا نہ تو کوئی طبیعی اثر اس کے جسم پر مرتب ہوتا ہے اور نہ ہی یہ معاشرہ کے کسی قانون کی زد میں آتا ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ اس کی ذات پر اس کا مضر اثر مرتب ہو جاتا ہے۔ کیونکہ غلط ارادہ بھی مستقل اقدار کی خلاف ورزی میں شامل ہے۔

شق اوّل سے متعلق اعمال کے سلسلہ میں ہم نے (بغرضِ تفہیم) یہ کہا ہے کہ ان کا اثر طبیعی ہوتا ہے اور ان اعمال کے مرتکب تک محدود۔ لیکن بنظرِ غائر دیکھا جائے تو ان کا اثر، ایک لحاظ سے، انسانی ذات پر بھی پڑتا ہے۔ توانا جسم اور عمدہ صحت، اقدارِ خداوندی کے مطابق کام کرنے کے لئے لاینفک ذرائع ہیں، اس لئے جو اعمال انسان کی صحت اور توانائی پر مضر اثرات مرتب کرتے ہیں، وہ بھی بالواسطہ، انسانی ذات کے ضعف کا موجب بنتے ہیں۔ لہٰذا اس قسم کے اعمال کا اثر بھی انسانی ذات پر پڑتا ہے۔ گھوڑے کا لاغر اور موٹر کا خراب ہونا آپ کے منزلِ مقصود تک پہنچنے میں حائل ہو جاتا ہے۔

اِن تصریحات سے واضح ہے کہ انسان کے ہر عمل کا اثر، بالواسطہ یا بلاواسطہ، اس کی ذات پر مرتب ہوتا ہے اور اس کے لئے نہ تو دار و گیر کی کسی خارجی مشینری کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ ہی کسی عدالت کی طرف سے سزا ملنے کی حاجت۔ یہی ہے وہ مقام جس کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ (۹۰/۷) کیا انسان یہ سمجھتا ہے کہ اسے کوئی دیکھ نہیں رہا؟ اگر وہ ایسا سمجھتا ہے تو وہ فریبِ نفس میں مبتلا ہے۔ جو اثرات اس کی ذات پر مرتب ہوتے ہیں ان کے لئے اس کی ضرورت ہی نہیں کہ کوئی اسے دیکھ رہا ہے یا نہیں۔ "کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے" کا سوال اعمال کی صورت میں پیدا ہوتا ہے جو مرئی اور محسوس ہوں۔ لیکن وہاں تو یہ کیفیت ہے کہ يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ (۴۰/۱۹) دل میں گذرنے والے خیالات اور نگاہ کی خیانتیں تک بھی چھپی نہیں رہ سکتیں۔ وہ بھی اپنا اثر مرتب کر کے رہتی ہیں۔ اس کے لئے نہ کسی سپاہی کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ ہی گواہ کی حاجت۔ بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰى نَفْسِهٖ بَصِيْرَةٌ (۷۵/۱۴) انسان خود اپنے خلاف آپ محاسب اور گواہ ہوتا ہے۔ اس کے لئے نہ کسی تھانے میں ہسٹری شیٹ کھولنے کی ضرورت پڑتی ہے، نہ "بستہ الف یا بستہ ب" مرتب کرنے کی حاجت۔ كُلَّ اِنْسَانٍ اَلْزَمْنٰهُ طٰٓئِرَهٗ فِيْ عُنُقِهٖ - (۱۷/۱۳) ہر انسان کا ہسٹری شیٹ اس کی گردن میں لٹکا رہتا ہے۔ اسے کوئی

اور پڑھ کر بھی نہیں سنانا۔ اِقْرَاْ كِتَابَكَ (۱۷/۱۴) وہ اپنا اعمال نامہ خود آپ پڑھتا ہے۔ وَكَفٰى بِنَفْسِكَ الْيَوْمَ عَلَيْكَ حَسِيْبًا۔ (۱۷/۱۴) اور پھر اپنی جزا اور سزا کا حساب بھی خود ہی کرتا ہے۔

(۰)

جس طرح افراد کے معاملہ میں مستقل اقدار کی خلاف ورزی، گرفت اور سزا کا موجب بنتی ہے۔ اسی طرح اقوام کی صورت میں بھی، ان اقدار سے سرکشی کا نتیجہ ان کی تباہی اور بربادی ہوتا ہے۔ اقوام بھی تو افراد ہی کا مجموعہ ہوتی ہیں۔ مستقل اقدار کی خلاف ورزی سے افراد کی ذات تشتت و اضمحلال کا شکار ہو جاتی ہے اور اس قسم کے افراد پر مشتمل قوم، اجتماعی طور پر تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ قرآن کریم نے، بے شمار مقامات پر، اقوام سابقہ کے جرائم اور ان کی وجہ سے ان کی تباہی اور بربادی کا عبرت آموز تذکرہ کیا ہے۔ ان اقوام کے احوال و کوائف بیان کرنے کے بعد، حضور نبی اکرمؐ کے مخالفین کو مخاطب کر کے کہا گیا:

وَلَقَدْ مَكَّنّٰهُمْ فِيْمَآ اِنْ مَّكَّنّٰكُمْ فِيْهِ وَجَعَلْنَا لَهُمْ سَمْعًا وَّاَبْصَارًا وَّاَفْـِٕدَةً ۖ فَمَآ اَغْنٰى عَنْهُمْ سَمْعُهُمْ وَلَآ اَبْصَارُهُمْ وَلَآ اَفْـِٕدَتُهُمْ مِّنْ شَيْءٍ اِذْ كَانُوْا يَجْحَدُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ۔ (۴۶/۲۶)

ان اقوام کو ہم نے ملک میں اس قدر قوت اور تمکن عطا کر رکھا تھا کہ ایسی قوت اور تمکن تمہیں بھی نصیب نہیں۔ انہیں دیکھنے، سننے، سمجھنے، سوچنے کی صلاحیتیں حاصل تھیں۔ لیکن جب انہوں نے قوانین خداوندی سے سرکشی کی راہ اختیار کی تو ان کی یہ صلاحیتیں بے کار ہو کر رہ گئیں اور جس تباہی کا وہ مذاق اڑایا کرتے تھے، اس نے انہیں چاروں طرف سے گھیر لیا۔

ان قوموں کے جرائم کی جو تفصیل قرآن کریم نے دی ہے، وہ طول طویل ہے۔ لیکن ملخص ان کا یہ ہے کہ وَاِذَا بَطَشْتُمْ بَطَشْتُمْ جَبَّارِيْنَ۔ (۲۶/۱۳۰) وہ کمزوروں اور زیردستوں کو ظلم و استبداد کے آہنی شکنجہ میں اس شدت سے جکڑتے تھے کہ ان بیچاروں کی ہڈیاں تک ٹوٹ جاتی تھیں۔ جہاں تک فرد اور معاشرہ کا تعلق ہے، ناقص ہی سہی، لیکن پھر بھی ایک معاشرتی نظام عدل ایسا ہوتا ہے جو فرد کو ارتکاب جرم سے باز رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔ لیکن قوموں کی صورت میں اس قسم کا کوئی نظام نہیں ہوتا جو بالادست قوم کو کمزور اقوام پر ظلم اور زیادتی سے روکے۔ (جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے) قوموں کے نزدیک "جنگل کا قانون" ہی ہنج زندگی ہوتا ہے۔ یعنی اس میں ہر طاقتور کو حق حاصل ہوتا ہے کہ کمزور کو چبا ڈالے۔ اس کے برعکس، جب کوئی ایسی قوم برسرِ اقتدار آئے جو حیات آخرت پر ایمان رکھتی ہو تو اس کا فریضۂ زندگی، بلکہ ان کے اقتدار کی وجہ جواز، یہ ہوتی ہے کہ وہ مظلوموں کی حفاظت اور کمزوروں کی مدافعت کرے۔ وہ لوگ دنیا میں عدل کے محافظ اور انصاف کے پاسبان بن کر جیتے ہیں۔ ان کے نزدیک، عدل کی حدود کہاں تک پھیلتی ہیں، اس کا اندازہ

اس ایک اصول سے لگائیے جس پر وہ عمل پیرا ہوتے ہیں کہ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلٰٓى اَلَّا تَعْدِلُوْا ۔۔۔۔۔۔ اِعْدِلُوْا ...... (۵/۸) دیکھنا کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم اس سے عدل نہ کرو۔ ہمیشہ عدل کرو۔ دشمن کے ساتھ بھی عدل کرو۔ اس سے ایک قدم اور آگے بڑھ کر کہا کہ مظلوم کی فریاد کہیں سے آئے، فوراً اس کی امداد کے لئے پہنچو۔ اسے ظالم کی گرفت سے بچاؤ خواہ اس میں تمہیں اپنی جان تک بھی کیوں نہ دینی پڑ جائے۔ (۴/۷۵) دنیا کے ہر انسان ۔۔۔۔۔۔ بلا تفریق رنگ، نسل، زبان، وطن، مذہب و ملت ۔۔۔۔۔۔ کی جان، مال، عزت، آبرو، عصمت، معابد کی حفاظت کرو، کہ تمہیں صاحبِ اقتدار اسی مقصد کے لئے بنایا گیا ہے۔ اس قوم کے سامنے، فلاح و بقا کا اصول یہ ہوتا ہے کہ

وَاَمَّا مَا يَنْفَعُ النَّاسَ فَيَمْكُثُ فِى الْاَرْضِ (۱۳/۱۷)

وہی قوم، وہی نظام، وہی نظریۂ زندگی باقی رہ سکتا ہے جس کے پیشِ نظر کسی خاص قوم، خاص قبیلہ، خاص ملک کا مفاد نہیں بلکہ پوری کی پوری نوعِ انسان کی منفعت ہو۔ وہ اس اصول پر عمل پیرا ہونے سے بقا اور حیاتِ دوام حاصل کرتے ہیں۔

آپ نے دیکھا کہ مغرب کا مادی نظریۂ حیات اور قرآن کا حیاتِ آخرت کا نظریہ کس طرح ایک دوسرے کی ضد ہیں اور ان کے عملی نتائج کس طرح باہمدگر متخالف! آج ساری دنیا جس جہنم میں گرفتار ہے، وہ مادی نظریۂ حیات کا فطری نتیجہ اور اس کے شجرۃ الزقوم کا لازمی برگ و بار ہے۔ جب تک انسان اس نظریۂ حیات کا قائل رہے گا، اس جہنم کی آگ زیادہ سے زیادہ شعلہ خیز ہوتی جائے گی۔ اس کا علاج، اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظریۂ حیات کو بدلا جائے اور اس کی جگہ ایمان بالآخرت کو انسانی قلب کی گہرائیوں میں راسخ کیا جائے۔

لیکن، دوسروں کا ذکر کیا، یہ ایمان تو آج خود ہمارے دل کی گہرائیوں میں بھی راسخ نہیں، جو اس ایمان کے دعویٰ کی بنا پر اپنے آپ کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہم آخرت پر ایمان کے محض الفاظ دہراتے رہتے ہیں۔ اس ایمان کی کوئی خفیف سی جھلک بھی ہماری عملی زندگی میں نظر نہیں آتی۔ قرآنی نظریۂ حیات کو عملی زندگی کی اساس بنانے کا طریقہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس نظریۂ حیات کو طلبا کے نصابِ تعلیم کی اساس و بنیاد قرار دیا جائے۔ اور اس طرح یہ ان کے تصورات و معتقدات کی رگوں میں خونِ زندگی بن کر دوڑے۔ اسی میں ہماری زندگی کا راز ہے اور اسی سے انسانیت کی فوز و فلاح وابستہ!

ضرورت رشتہ
پنجاب سے متعلق، ۳۰ سالہ، والدین کے تنہا فرزند ارجمند، جو ایم اے (اردو ادب) ہیں اور انگلینڈ میں اچھے عہدے پر فائز ہ کے لئے برطانوی شہریت کی حامل اور مشرقی ماحول کی پروردہ، خوش شکل دوشیزہ رفیقۂ حیات مطلوب ہے جس کے لئے سوائے اس کے کہ وہ اور اس کے والدین ذات پات و خاندانی حیثیت اور دیگر مسرفانہ رسوم کی بندش سے مبرا ہوں اور کوئی قیود نہیں۔ (خط و کتابت صیغہ راز) ن۔ ف بمعرفت ناظم ادارہ طلوعِ اسلام ۔ ۲۵/بی گلبرگ ۲ لاہور

مدرسۂ علیگڑھ سے دانشگاہِ قرآنی تک

(صفدر سلیمی مرحوم)

(سرسید نے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو علی گڑھ مدرسہ کا سنگِ بنیاد رکھا۔ طلوعِ اسلام نے مئی ۱۹۶۵ء میں اس عظیم واقعہ کی یادگار منانے کے لئے ایک تقریب منعقد کی جس میں پرویز صاحب سے اپنے پیشِ نظر قرآنی کالج کی اسکیم پیش کی اور دیگر حضرات نے بھی خطاب کیا۔ محترم چوہدری عطاء اللہ صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا کہ اگر میں تناسخ کا قائل ہوتا تو بلا تامل کہہ دیتا کہ سرسیدؒ کی روح پیکرِ پرویز میں نمودار ہو رہی ہے۔ محترم صفدر سلیمی نے (جنہیں مرحوم لکھتے ہوئے اب بھی آنکھیں اشکبار ہو جاتی ہیں) ایک مبسوط خطاب پیش کیا۔ جسے ہم موجودہ وقت کے تقاضا کے پیشِ نظر ہدیۂ قارئین کرتے ہیں۔ اس سے پرویز صاحب کی زیرِ نظر قرآنی درسگاہ اور مرکزِ تحقیقات کی اہمیت واضح ہو جاتی ہے)۔

(۰)

قوموں کے عروج و زوال کی تاریخ نگاہوں کے سامنے لائیے۔ آپ دیکھیں گے کہ ایک قوم مدت سے غلامی، بے بسی اور بے چارگی کے عالم میں چلی آ رہی ہے۔ پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی زندگی میں ایک انقلابِ عظیم برپا ہو جاتا ہے۔ اس کی غلامی اور محکومی کی زنجیریں ٹوٹ جاتی ہیں۔ اس کی ذلّت و مسکنت اور مایوسیوں کے اندھیرے عروج و اقبال کی صبحِ بہار میں بدل جاتے ہیں اور وہ قوم زندگی کی ایک نئی انگڑائی لے کر کارگہِ سعی و عمل میں کود پڑتی ہے۔ سطح بین نگاہیں نہ تو اس انقلاب کے پس منظر کی گہرائیوں میں جا سکتی ہیں اور نہ تاریخ کے بین السطور سے اس سلسلۂ انقلاب کی ان ابتدائی کڑیوں کا تجزیہ کر سکتی ہیں جہاں یہ انقلاب ابھی اس قوم کے ضمیر میں کروٹیں لے رہا تھا اور افرادِ قوم کے قلب و نگاہ میں اس کے بیج بوئے جا رہے تھے۔ اس سطح بینی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس اِنقلاب کی تاریخ کا آغاز اس مرحلہ سے گردانا جاتا ہے۔ جب وہ محسوس و مشہود طور پہ نگاہوں کے سامنے آیا۔ اور اس کی بناء و تاسیس کے سہرے بھی اُن سروں پہ بندھ جاتے ہیں جن کی بدولت یہ ایک جیتی جاگتی حقیقت بن کر شادابیِٔ قلب و نگاہ کا سامان قرار پا گیا۔

طائرانِ پیش رس

لیکن جو مؤرخ اس انقلابِ عظیم کے پس منظر کا تجزیہ کرے گا اور اس کی نگاہیں اس داستانِ انقلاب کے پیچ و خم جائزہ لیں گی تو اسے صاف نظر آئے گا کہ اس

کش مکشِ انقلاب کا حقیقی آغاز اس کے ظہورِ نتائج سے بہت عرصہ قبل ہوچکا تھا۔ اس پس منظر میں کتنے ہی دیوانوں اور سرپھروں کی ان حسرتوں اور ارمانوں کا رقصِ پروانہ نظر آئے گا جو اندر ہی اندر تڑپ کر ختم ہوگئیں۔ تاریخ میں ان زعماء کے نام تو سنہری حروف میں لکھ دیئے گئے جو اس انقلاب کے محسوس و مشہود نتائج لے کر سامنے آئے۔ لیکن بہت کم نگاہوں نے ان دیوانوں کا سراغ لگانے کی ضرورت محسوس کی جنہوں نے سب سے پہلے تند و تیز آندھیوں میں دیپ جلائے اور منزل کی تڑپ میں جل جل کر اس شمع پر قربان ہوگئے۔

تحریکِ پاکستان کے سلسلے میں بھی اس قسم کی صورتِ حالی سامنے آتی ہے۔ ہم ۲۳ مارچ ۱۹۴۰ء کی قراردادِ لاہور کو اس کا حرفِ آغاز قرار دیتے ہیں۔ ہماری تحقیق قدرے ماضی کی طرف لوٹتی ہے تو ہم علامہ اقبالؒ کے ۱۹۳۰ء کے الہ آباد کے خطبۂ صدارت کو اس تحریک کا سرِ عنوان سمجھتے ہیں اور اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ پاکستان کا تصوّر علاّمہ اقبالؒ کی بصیرتِ قرآنی کا شاہکار ہے۔ اور مملکتِ پاکستان کا جیتا جاگتا نقشہ قائدِاعظمؒ کے حسنِ تدبر کا پیکرِ محسوس ہے۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ پاکستان کے حصول و قیام میں ان مایۂ ناز شخصیتوں کے مقامِ بلند پر کوئی حرف آئے۔ ہمیں اس حقیقت کا بھی کھلا اعتراف ہے کہ اقبالؒ و جناحؒ کے بغیر ہم شاید اس منزلِ مراد کو ہی کھو بیٹھتے اور ابدی غلامی میں دم توڑ کر رہ جاتے۔ یہ سب کچھ بجا اور درست ہے۔ لیکن ہم آج جس حقیقت کی نقاب کشائی کی ضرورت محسوس کر رہے ہیں وہ یہ ہے کہ اس برِّصغیر کے مسلمانوں کے قومی تشخص کا تقاضا ۱۹۳۰ء سے بھی بہت پہلے اُبھر چکا تھا۔ اور اس سے ایک طویل مدت قبل ہماری نشاۃِ ثانیہ کا وہ طائرِ پیش رس مائل پرواز ہوچکا تھا جس کے ذوقِ بال کشائی نے ایک صدی قبل، ہندوؤں کے مقابلہ میں یہاں کے مسلمانوں کے لئے ان کی جداگانہ منزل کی نشان دہی کر دی تھی۔

ہماری عظمتِ رفتہ کا یہ عظیم المرتبت داعی اور ہماری کش مکشِ انقلاب کا یہ طائرِ پیش رس سرسیّد علیہ الرحمۃ تھا جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کے ہولناک نتائج سے اپنی قوم کو بچانے کے لئے آگے بڑھا اور بے گانوں کی مخالفت تو ایک طرف خود اپنی ہی قوم کے مذہبی پیشواؤں کی تند و تیز آندھیوں میں سفینۂ ملّت کی ناخدائی کا فریضہ بے مثال عزم و ہمّت اور جرأت و استقلال سے سرانجام دیتا رہا۔ سرسیّد کا یہ کارنامہ ہماری تاریخ میں ہمیشہ ہمیشہ...... ایک مثالی شاہکار قرار پائے گا۔ اور ہر حقیقت پسند یہ تسلیم کرنے پر مجبور ہوگا کہ اگر سرسیّدؒ نہ ہوتے تو ہمارا بیش بہا سرمایۂ ملّی یقیناً اقبالؒ و جناحؒ جیسے گہر لئے آبدار سے محروم ہوتا۔ یہ تمام درخشاں ستارے جو بیسوی صدی عیسوی کے آغاز سے ہمارے مطلعِ تقدیر پر اُبھرتے اور جگمگاتے چلے آرہے ہیں لاریب کہ یہ ان قومی تعلیمات کی اشاعت کا نتیجہ ہیں جن کی تحریک سرسیّد کی مومنانہ فراست اور حسنِ تدبّر کے صدقے میں آغاز پذیر ہوتی۔

آغازِ سفر سے پہلے

نشۂ آزادی میں سرمست پاکستانیوں کی نگاہوں کو آج ایک بار عہدِ رفتہ کی طرف لوٹا کر اس سانحہ قیامت پر غور کر لینا چاہیئے جو ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی میں شکستِ فاش اور نامرادی و حرماں نصیبی کے بعد اس کی زندگی میں ابھرا تھا۔ جب غیر ملکی حکمرانوں کا جوشِ انتقام ان کے وجود تک کو ختم کرنے کا تہیہ کر چکا تھا۔ جب انتقامی جذبات کی تندی میں "برادرانِ وطن"

سے محبت کی پینگیں بڑھائی جارہی تھیں۔ تعلیمی و دفتری نظام میں مسلمانوں کو اچھوتوں کی حیثیت دی جارہی تھی، اور ڈاکٹر ہنٹر جیسے ذمہ دار انگریز اپنی قوم میں ایسے لٹریچر کی اشاعت میں سرگرم کار تھے جس کی رُو سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ جب تک اِس برصغیر کے ایک ایک مسلمان کو گولی سے نہیں اُڑا دیا جائے گا انگریز امن و چین سے حکومت نہ کر سکے گا۔

(۰)

یہ تھے وہ حالات جب سر سید کی نگہِ دُور رَس نے اپنی قوم کو ابدی ذِلّت، شکست اور موت سے بچانے کا دوٹوک حل تلاش کر لیا اور یہ حل تھا مسلمانوں کے لئے اُن کے تقاضائے ملّی کی مناسبت سے قومی تعلیمات کا الگ انتظام۔ سر سیدؒ اس کے لئے سب سے پہلے ۱۸۶۳ء میں "سائنٹیفک سوسائٹی" کی تاسیس عمل میں لائے۔ اور اس کی وساطت سے فلسفہ و سائنس کے جدید ترین لٹریچر کو اپنی قومی زبان میں منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا۔ پھر اس کی نشر و اشاعت کے لئے ۱۸۶۶ء میں "علی گڑھ انسٹی ٹیوٹ گزٹ" کا اجراء کیا اور پھر ایک عظیم تر مقصد کے لئے اپنے جگر پاروں سمیت ۱۸۶۹ء میں انگلستان کا سفر اختیار کیا اور اکتوبر ۱۸۷۰ء میں جب وہ واپس لوٹے تو ماہنامہ "تہذیب الاخلاق" کے ذریعہ اس عظیم مقصد کی نشر و اشاعت شروع کر دی جس کی خاطر یہ ساری ابتلائیں اور آزمائشیں قبول کی گئی تھیں۔ یہ عظیم مقصد تھا مدرسہ علی گڑھ کا قیام جو ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کو عمل میں آیا اور بہت جلد علی گڑھ کالج اور پھر علی گڑھ یونیورسٹی کی شکل اختیار کر گیا۔

تاریخی اور مبارک دن

مدرسہ علی گڑھ کا قیام شاید سطح بین نگاہوں میں ایک معمولی درسگاہ کا قیام ہو جس سے کہیں بڑی درسگاہیں اُس وقت برصغیر کے طول و عرض میں پھیلی ہوئی تھیں لیکن ایک نگہِ بصیرت جانتی ہے کہ یہ ایک عام مدرسہ کی رسمِ تاسیس نہیں تھی۔ بلکہ تحریکِ پاکستان کے اس ایوانِ استقلال کی پہلی اینٹ رکھی جا رہی تھی جسے آئندہ چل کر عالمِ اسلام کی امیدوں کا مرکز و محور بننا تھا۔ اس لحاظ سے ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کا دن ایک مدرسہ کا یومِ تاسیس نہیں تھا، بلکہ یہ وہ مبارک و مسعود اور تاریخی دن تھا جس سے ہماری عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کی صبحِ بہار طلوع ہوئی۔ تاریخ کا ہر انقلابِ عظیم سب سے پہلے قلب و نگاہ میں تبدیلی کا تقاضہ کرتا ہے اور یہ خوشگوار اور خوش آئند تبدیلی صرف صحیح تعلیم سے رونما ہوتی ہے۔ ملک میں سینکڑوں مذہبی درسگاہیں موجود تھیں۔ خود انگریز حکمران ملک کے طول و عرض میں اپنی ضرورت کے پیشِ نظر اسکولوں، کالجوں اور یونیورسٹیوں کا جال پھیلائے جا رہے تھے۔ لیکن اِس داعیِ انقلاب کی نگہِ دُور رَس صاف طور پر یہ دیکھ رہی تھی کہ ملّتِ اسلامیہ کے مرضِ کہن کا چارہ نہ مکتبِ مُلّا میں ہے نہ انگریز کے قائم کردہ کالجوں اور یونیورسٹیوں میں۔ مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کے تقاضے اُن کی نئی نسلوں کے لئے اپنی جداگانہ قومی تعلیمات کا تقاضہ کر رہے ہیں۔ ۲۴ مئی ۱۸۷۵ء کا مبارک دن مدرسۂ علی گڑھ کے قیام سے اسی تقاضائے ملّت کا حقیقی جواب دے رہا تھا۔

مدرسۂ علی گڑھ کے قیام سے سر سیّدؒ نے جو شمع روشن کی تھی اس نے ایک دن علی گڑھ یونیورسٹی کی صورت اختیار کر لی۔ اس شمع کی ضوفشانیاں چاروں طرف پھیلتی چلی گئیں اور ان کے صدقے میں برِصغیر کے چپے چپے پر نئے چراغ روشن ہوتے گئے۔ یہ مسلمانوں کی اپنی درسگاہیں اور یونیورسٹیاں تھیں، جہاں مسلمان طالب علموں کو جدید اور مروّجہ علوم کی روشنی بھی حاصل ہوتی تھی اور اسلامی تعلیمات کی صورت میں اپنے جداگانہ قومی تشخص کا جذبۂ احساس بھی دلوں میں نشوونما پاتا تھا۔ قومی تعلیمات کی ان فضاؤں میں نوجوانانِ ملّت کی عقابی روحوں کو ذوقِ پرواز ملتا رہا اور ان میں سے سینکڑوں نوجوان قوم کے مطلعِ تقدیر پر درخشندہ ستارے بن کر چمکے اور مایوسی اور شکست کی تاریک فضا میں عمل برانگیز امنگوں سے یقین و اعتماد کی روشنی پھیلا دی۔

منزل و مقصود

ایک ہنگامہ پسند قوم کے لئے مدرسہ علی گڑھ کا قیام شاید کوئی عظیم کارنامہ نہ سمجھا جائے لیکن ہمارے ایوانِ استقلال کی یہ پہلی اینٹ رکھنے کے لئے سر سیّدؒ کو کیا کچھ کرنا پڑا وہ علی رؤس الاشہاد بتا دے گا کہ معاملہ کس قدر اہم تھا۔ اس سنگِ بنیاد سے سر سیّدؒ کی کس قدر مقدس آرزوئیں وابستہ تھیں اور اس کے لئے انہوں نے کن کڑی آزمائشوں کا سامنا کیا۔ اس مقصد کے لئے جب وہ انگلستان روانہ ہو رہے تھے تو اس روانگی کی تفصیل بیان کرتے ہوئے نواب محسن الملک نے لکھا تھا:۔

> جب سر سیدؒ انگلستان جانے کو تھے تو مشکلات اس قسم کی تھیں کہ اگر کوئی دوسرا شخص ہوتا تو اس ارادہ کو پورا نہ کر سکتا۔ انہوں نے اپنے کتب خانہ کو بیچا۔ کوٹھی کو رہن رکھا اور سفر کی تیاری شروع کی۔ انہوں نے بار ہا مجھ سے کہا کہ میرا مقصود پورا نہیں ہو سکتا جب تک میں بذاتِ خود اصول و طرزِ تعلیم سے واقفیت حاصل نہ کر لوں۔
>
> (حیاتِ جاوید)

سوچئے کہ کیا یہ سب کچھ ایک عام مدرسہ قائم کرنے کے لئے ہو رہا تھا یا اس مدرسہ کے قیام سے ایسے بلند مقاصد پیشِ نظر تھے جو حالات کے دھارے اور تاریخ کے رُخ کو بدل دیں۔

نواب محسن الملک نے آنریبل حاجی محمد اسمٰعیل خاں کے نام ایک مکتوب میں اُن مقاصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا تھا:۔

> سر سیّد احمد خانؒ ولایت گئے مگر اس مقصد سے کہ اپنی آنکھ سے اس قوم کو جو اس وقت تمام اقوامِ روئے زمین پر شرف رکھتی ہے، انہی کے گھروں اور انہی کے ملک میں دیکھیں اور جو کچھ وہاں دیکھا ہو اسے واپس آکر اپنی قوم میں پھیلائیں۔ لوگ ولایت جا کر تھیٹر، پارک، میوزیم اور عمارتوں کی سیر کرتے ہیں، اور یہ حامیٔ زمین اسلام کتب خانہ میں بیٹھا ہوا "خطباتِ احمدیہ" کی تصنیف میں منہمک تھا۔ کالجوں اور یونیورسٹیوں کے انتظام پر غور کر رہا تھا۔ اس شخص کا انگلستان جانا قوم کے لئے تھا، رہنا قوم کے لئے تھا، اور پھر

واپس آنا قوم کے واسطے تھا۔ (ایضاً)

جہدِ مسلسل اور اس کا انجام

مدرسۃ علی گڈھ کو اسلامیانِ برِّ صغیر کی واحد قومی یونیورسٹی کے درجے تک لے جانے کے لئے جو عظیم منصوبہ سرسیدؒ کے ذہن میں تھا اس کے لئے لاکھوں روپے کی ضرورت تھی لیکن اس اولوالعزم انسان نے یہ سارا بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھا لیا۔ اپنے مشن کی تکمیل کے لئے وہ سالوں تک جگہ بجگہ کشکولِ گدائی ہاتھوں میں لئے پھرا۔ ان کے احباب دیتے دیتے تھک گئے لیکن وہ مانگتے مانگتے کبھی نہ تھکتے تھے۔ انہوں نے اپنی اس کیفیت کا ذکر کرتے ہوئے ایک آرٹیکل میں لکھا تھا:۔

> ہمارا حال تو اب یہ ہو گیا ہے کہ دوست بھی اب ملتے ہوئے ڈرتے ہیں کہ کچھ سوال نہ کر بیٹھیں۔ ہماری صورت ہی اب سوال ہو گئی ہے۔ میں نے ایک دوست سے کہا کہ ہماری قسمت میں بھیک مانگنا لکھا ہے۔ سو اس لکھے کی بدملا تا ہوں۔ مگر شکر ہے کہ اپنے لئے نہیں بلکہ قوم کے لئے۔ (حیاتِ جاوید)

اُن دِنوں مذہبی طبقے نے چاروں طرف سے اس زعیمِ ملّت پر کفر کے فتووں سے یلغار کر رکھی تھی لیکن سرسیدؒ کی آواز کام کر گئی۔ قوم نے اس کا دامن دولت سے بھر دیا اور اس خطیر رقم سے علی گڈھ میں کالج اور یونیورسٹی کی پرشکوہ عمارتوں کا سلسلہ پھیلتا چلا گیا۔ ان عمارتوں کو دیکھ مسلمانوں کی عظمتِ رفتہ کی جھلک نگاہوں میں عود کر آتی تھی۔ ملک کے ایک ممتاز مسلمان نے علی گڈھ یونیورسٹی کے اس حسین وجمیل سلسلۂ تعمیر کو دیکھ کر کہا تھا کہ

خراجِ تحسین

> جب تک یہ عمارتیں قائم ہیں مسلمان یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ ہم مرے ہوئے بھی وہ کام کر جاتے ہیں جو زندوں سے نہیں ہو سکتے۔ (حیاتِ جاوید)

ایک ایرانی سیاح نے اِن عماراتِ کو دیکھا تو فرطِ مسرت سے جھومتے ہوئے بے ساختہ اس کی زبان سے نکلا:۔

> واللہ! معجزہ می نماید۔ کاردیکہ از سلطنت برنیا ید چگونہ از یک فردِ رعیّت انجام شد۔ (حیاتِ جاوید)

برطانوی تعلیمی کمیشن کے چیئرمین مسٹر وارڈ نے ایک ایڈریس کے جواب میں سرسیدؒ کو اس کارنامہ پر خراجِ تحسین پیش کرتے ہوئے کہا تھا کہ

> جس وقت مَیں نے کمروں کی اُن قطاروں کو دیکھا جو مکمل ہونے کے بعد دنیا میں اپنی قسم کی سب سے عمدہ عمارتیں ہوں گی تو میں نے محسوس کیا کہ کوئی شخص ایسا نہ ہو گا جس کے دل میں ان مکانات کو دیکھ کر نئی ہمت پیدا نہ ہو۔

سنہ ۱۸۸۰ء میں یہ کام ابھی ابتدائی منزل میں تھا لیکن دوربین نگاہیں اس حسینِ آغاز کا انجامِ جمیل دیکھ رہی تھیں۔

چنانچہ اسی سال جب گورنر یو۔ پی سر جان اسٹریچی یہاں سے انگلستان کو رخصت ہوئے تو انہوں نے اپنی الوداعی تقریر میں کہا کہ

سب سے بڑا اور آخری کام جس میں انہوں نے (سر سیدؒ نے) اپنی زندگی اور وسائل کو وقف کیا۔ یعنی اپنے ہم وطنوں کی تعلیم اور اُن کی ترقی .... یہ وہ کام ہے جس کے بعض نتائج کا ہم مشاہدہ کر رہے ہیں۔ مجھے قطعاً شبہ نہیں کہ یہ نتائج آئندہ زمانے میں اور بھی عجیب و غریب صورت اختیار کریں گے۔　(حیات جاوید)

سر انتھونی میکڈانلڈ نے اس دانش گاہِ ملّی کے درخشندہ اور تابناک مستقبل کی شہادت دیتے ہوئے کہا تھا:۔

یہ امید کرنا قطعاً مبالغہ آرائی نہیں کہ یہ کالج ترقی پا کر مسلمانوں کی بہت بڑی انسٹی ٹیوشن بن جائے گا اور دنیائے مشرق کا قرطبہ ثابت ہوگا۔　(ایضاً)

علی گڈھ نئی نسل کی تعلیم و تربیت میں کس قسم کا معرکہ سرانجام دے گا اس کا جواب برطانوی پارلیمنٹ کے ممتاز رکن مسٹر کین سے سنیئے جو ان دنوں ایک فلاحی پروگرام کے سلسلے میں تبلیغی مشن پر نکلے تھے۔ اور اپنی تصنیف (PICTURESQUE - INDIA) میں انہوں نے اپنے تاثرات بیان کرتے ہوئے لکھا تھا کہ

یہ اُمید کی جا سکتی ہے کہ جو طالب علم یہاں سے نکلیں گے وہ قدیم تصورات پر جدید علوم کا پیوند لگائیں گے اور ماضی کی طرف دیکھنے والوں کو حال کے تقاضوں کا ساتھ دینے پر آمادہ کریں گے۔

آگے چل کر وہ مزید لکھتے ہیں:۔

قوم کی اُمیدیں اس انسٹی ٹیوشن سے وابستہ ہیں۔ یہ ایک عظیم کوشش ہے جو ترقی اور اصلاح کے میدان میں ایک ایسی قوم سے بروئے کار آئی ہے جس میں تقدیر پہ بھروسہ کرنے کے عقیدہ نے تمام ہمتیں اور ارادے پست کر دیئے تھے۔

مشہور فاضل انگریز سر آکلینڈ کالون نے اس زعیم ملّت کی وفات پر کس قدر درست کہا تھا کہ

جس شخص کو آج آپ رو رہے ہیں یاد رکھئے کہ وہ اس قدر مفلس تھا کہ اس کے پاس نہ رہنے کو گھر تھا۔ اور نہ مرنے کو۔ لیکن وہ آپ کے لئے ایک گراں مایہ خزانہ چھوڑ گیا اور یہ نشانِ منزل دے گیا کہ تعصب اور جہالت کے مقابلے میں شریفانہ جنگ جاری رکھو۔

سر سیدؒ کی اسی عظمتِ کردار پر برادران وطن کو رشک آرہا تھا۔ چنانچہ شمس العلماء مولانا ذکاء اللہ نے اپنی ایک تحریر میں اس فاضل ہندو لیڈر کا ذکر کیا ہے جس نے جلسۂ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ

ہم مسلمانوں سے دولت میں کہیں زیادہ ہیں۔ تعلیم میں فائق ہیں، تعداد میں کہیں بڑھ کر ہیں۔ لیکن ہم میں کوئی سر سیدؒ نہیں۔ بلکہ ہم بیس مل کر بھی ایک ہو جائیں تو سر سیدؒ کے

ہم پلّہ نہیں ہو سکتے۔

مخالفت یہ تھا عظیم سرسیدؒ اور یہ تھا اس کا علی گڈھ۔ دنیا کی نامور شخصیتیں اس کی عظمتِ کردار کو خراج تحسین پیش کر رہی تھیں۔ ہمسایہ قوم کے فاضل رہنما اپنے دلوں میں یہ حسرت لئے ہوئے تھے کہ ملے کاش! ان میں بھی کوئی سرسیدؒ ہوتا۔ لیکن سرسیدؒ کی اپنی ملت کے اجارہ دار اس پر تکفیر کے تیروں کی بوچھاڑ کر رہے تھے۔ اور پورے جوش وخروش اور غیظ و غضب میں یہ "فریضہ" سرانجام دیے رہے تھے کہ قوم کی نشأۃ ثانیہ کی جہدِ مسلسل خاسرو ناکام ہو کر رہ جائے۔ اس فتوے کے الفاظ پر غور کیجئے، جس پر یہاں کے سا مٹھ مفتیانِ عظام کے علاوہ مکہ و مدینہ کے مذہبی اکابرین کی مہرِ تصدیق حاصل کی گئی تھی۔ ارشاد ہوتا ہے کہ

> یہ شخص ضال اور مضل ہے۔ بلکہ ابلیسِ لعین کا خلیفہ ہے کہ مسلمانوں کے اغوا کا ارادہ رکھتا ہے اس کا فتنہ یہود و نصاریٰ کے فتنے سے بڑھ کر ہے واجب ہے اولی الامر پر اس سے انتقام لینا
>
> (حیاتِ جاوید)

مدینہ کے مفتیٔ احناف شیخ محمد امین بابی نے متعلقہ استفتاء کے جواب میں تحریر فرمایا کہ

> یہ شخص یا تو ملحد ہے یا شرع سے کفر کی جانب مائل ہو گیا ہے۔ یا زندیق ہے کہ کوئی دین نہیں رکھتا۔ اگر اس نے گرفتاری سے پہلے اس سے توبہ کر لی اور ان گمراہیوں سے رجوع کی اور توبہ کی علامتیں اس سے ظاہر ہو گئیں تو قتل نہ کیا جائے۔ ورنہ دین کی حفاظت کے لئے اس کا قتل واجب ہے۔ اور ولایت الامر پر واجب ہے کہ ایسا کریں۔ (ایضاً)

دارالعلوم علی گڑھ کے متعلق مولوی کریم اللہ دہلوی فتویٰ صادر فرماتے ہیں کہ

> تعمیر کرنا اور کرانا بقول و فعل اس قائل کے ایسے مکان کا اور معاونت کرنی ایسے طلباء کی بالکل باطل اور ایسے ناپاک کا نام مدرسہ رکھنا اور محلِ تعلیم و تحصیل سمجھنا آدمیت سے نکلنا ہے۔ اور زمرۂ حیوانات میں داخل ہونا ہے ...... بلکہ صرف کرنا مال کا ایسے محل میں موجب کندہ ہونا جہنم، اور ایسے بے محل میں ساعی ہونا۔ ہیمہ اور حطب بننا لازم........ تُے نئے یوں سمجھئے کہ میں اپنے ہاتھ سے جہنم میں مکان تعمیر کرتا ہوں۔ (ایضاً)

اسی دارالعلوم کے متعلق مدینہ منورہ کے مفتیوں کا فتویٰ سنئے لکھتے ہیں:-

> یہ مدرسہ جس کو خدا برباد کرے اور اس کے بانی کو ہلاک کرے۔ اس کی اعانت جائز نہیں۔ اگر مدرسہ تیار ہو جائے تو اسے منہدم کرنا اور اس کے بانی اور مددگاروں سے سخت انتقام لینا واجب ہے۔ (ایضاً)

وہ تھا کافر، ملحد اور زندیق (معاذ اللہ) سرسیدؒ کا کردار۔ اور یہ تھا ہمارے مفتیانِ شرعِ مبین کا حسنِ اخلاق! سوچئے کہ تاریخ نے کیا فیصلہ صادر کیا۔ سرسیدؒ کا نام ایک عظیم اور شہرۂ آفاق زعیم ملت کی حیثیت سے تاریخ کے صفحات پر جگمگا رہا ہے۔ اس کی کافری نے ایک مردہ قوم کو زندگی عطا کی۔ اور ان فتویٰ بازوں کو کوئی جانتا

تک نہیں کہ کہاں سے آئے تھے اور کہاں چلے گئے۔ اگر ان کا کہیں ذکر آتا بھی ہے تو اس حیثیت سے کہ یہ سرسیدؒ کی عظیم جد و جہد کی راہ میں کس طرح مذہب کا نقاب اوڑھ کر حائل ہوئے۔

مذہبی پیشوائیت کی یہ تخریبی روش ہر سچے داعیٔ انقلاب کے خلاف ہر دور میں جاری رہی۔ دینِ حق کا ہر علمبردار جو عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے اپنی جان لڑاتا رہا، تکفیر کے ان تیروں کا شکار بنتا رہا۔ یہ شروع سے ہوتا چلا آیا ہے اور آج ہو رہا ہے اور آئندہ بھی ہوتا رہے گا۔ کرنے والے اپنا کام کر گئے۔ قوم کی بگڑی بنا گئے۔ تاریخ کا رُخ بدل گئے اور تاریخ نے ان کی عظمتِ کردار کو اپنے دامن میں ہمیشہ کے لئے محفوظ کر لیا۔ لیکن جو لوگ مذہبی تقدس کا لبادہ اوڑھ کر ان کی راہ میں کانٹے بچھاتے رہے۔ انہیں قوم اور تاریخ کی بارگاہ سے رسوائی اور روسیاہی کے سوا کچھ نصیب نہ ہوا۔

---(٠)---

حقیقی داعیٔ انقلاب

گزشتہ ایک صدی کی تاریخ میں ہمارے ہاں کسی وقت بھی ہنگامہ پسند طالع آزماؤں کی تعداد میں کمی واقع نہیں ہوئی۔ یہ لوگ قوم کے زعیم بن کر ہمیشہ قوم کے جذبات سے کھیلتے رہے۔ مذہب و سیاست، جس پہلو سے بھی بن پڑا انہوں نے عوام کے جذبات کو مشتعل کر کے کچھ ہنگامے ضرور پیدا کر دیئے۔ لیکن ان ہنگاموں سے قوم کی توانائیوں کو ضائع کرنے کے سوا کوئی قابلِ ذکر مقصد پورا نہ ہو سکا۔ سرسیدؒ کی عظیم شخصیت ان ہنگامہ پسند زعماء سے قطعاً مختلف تھی۔ وہ قوم کی تاریخی روایات کے شایانِ شان خارجی دنیا میں ایک اساسی انقلاب بروئے کار لانے کے لئے افرادِ ملت کے قلب و نگاہ میں صحیح انقلاب کی کارفرمائی ناگزیر سمجھتے تھے۔ اس لئے جب انہوں نے عظمتِ رفتہ کی بازآفرینی کے لئے اپنی ہر متاعِ عزیز کی بازی لگانے کا فیصلہ کیا تو اس کا پہلا قدم یہی قرار دیا کہ حالات کے تقاضوں کے مطابق اپنی آئندہ نسلوں کے لئے تعلیم و تربیت کا صحیح انتظام کیا جائے۔

علی گڑھ نے قومی انقلاب کے اس اساسی تقاضا کی حسن و خوبی سے پذیرائی کی۔ قومی زوال اور شکست کی ان تہلکہ انگیزیوں میں جو ۱۸۵۷ء کے ٹکراؤ کا نتیجہ تھیں۔ وہ سب سے پہلے قوم کے احساسِ خودی اور انفرادیت کو نمایاں طور پر ہر فردِ ملت کے دل و دماغ میں جاگزیں کرنا چاہتے تھے۔ یہ مقصد علی گڑھ نے پورا کر دیا۔ قوم کے ہزاروں نوجوان اس دعوتِ انقلاب کے علمبردار بن کر میدانوں میں نکل آئے جس کے لئے سرسیدؒ کو کبھی کوئی رفیقِ کار تک میسر نہ تھا۔ ان تعلیمی کاوشوں نے قلوب و اذہان میں ایک روشنی سی پیدا کر دی۔ قوم کا احساسِ خودی انگڑائیاں لینے لگا۔ فضا حرکت و عمل کے لئے تیار تھی اور اس حکیم انقلاب کا انتظار تھا جو اس کاروانِ شوق کو اس کی منزل کے سراغ سے بہرہ ور کرتا۔ بالآخر ۱۹۳۰ء میں یہ سعادت اقبالؒ کے حصے میں آئی۔ انہوں نے ببانگِ دہل اپنے قافلے کو نشانِ منزل کی خبر دی اور جب قائدِاعظمؒ نے سالارِ انقلاب کی حیثیت سے اس قافلے کی عنانِ قیادت اپنے ہاتھوں میں لی تو سرسیدؒ کا علی گڑھ، کارواں بن کر میدان میں آ گیا اور تحریکِ پاکستان کو منزلِ مراد تک پہنچانے میں وہ تاریخی کارنامے سرانجام دیئے جن کی شہادت تاریخ کے زرّیں اوراق دے رہے ہیں۔

نئی منزل اور نئے تقاضے

اگست ۱۹۴۷ء میں تحریکِ علی گڑھ کا مشن حاصلِ تکمیل کو پہنچ گیا۔ سرسیدؒ، قوم کے بڑھتے ہوئے قدم جس منزلِ مراد تک گامزن دیکھنا چاہتے تھے وہ منزل خود قدم لینے کو آگے بڑھ آئی۔ اس کے بعد جو منزلیں سامنے آرہی تھیں۔ ان کے تقاضے پہلے سے مختلف نوعیت کے تھے۔ علی گڑھ نے حصولِ پاکستان کی تحریک میں اپنا فریضہ کامیابی سے پورا کر دیا، لیکن اب سوال قرآنی خطوط پہ اس مملکت کی تشکیل کا تھا۔ ویسے بھی برِصغیر کے نئے خاکوں میں علی گڑھ کا رشتہ پاکستان سے کٹ کر رہ گیا اور علی گڑھ کی روح کو کچلنے میں مہاسبھائی ذہنیت جو ہتھکنڈے بروئے کار لا رہی تھی اس کے بعد یہ ممکن ہی نہیں تھا کہ علی گڑھ اس نئی مملکت کی تشکیل میں ہمارا ہاتھ بٹا سکے۔ علی گڑھ کی قومی تعلیمات کا یہی کارنامہ کچھ کم نہیں تھا کہ اس نے ہمیں اس منزل تک پہنچانے میں بہترین اسباب و وسائل مہیا کئے۔ اب اس نئی دنیا، نئی فضا، نئے ماحول اور نئے تقاضوں میں ملتِ پاکستان کو ایک نئے سرسیدؒ اور نئے اقبالؒ کی ضرورت تھی اور اسے مبدائے فیض کی کرم گستری سمجھئے کہ ایسے اسلاف کا جانشین ہمیں اس مفکرِ قرآن کی صورت میں بروقت مل گیا جسے پاکستان اور بیرونِ پاکستان میں پرویز کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ جس کے ہاتھوں میں ۱۹۳۸ء میں خود فکرِ اقبالؒ نے طلوعِ اسلام کا ننھا سا دیا تھما دیا اور قرآن کا یہ شہرۂ آفاق طالب علم گذشتہ ستائیس (۲۷) برس سے تند و تیز آندھیوں میں بحفاظت تمام اس چراغ کو منزل بہ منزل آگے بڑھائے چلا آرہا ہے تاکہ اس منزل کے راہی کہیں سرِراہ ٹھوکر نہ کھانے پائیں۔ اور ان کی راہیں اس فکرِ قرآنی سے روشن رہیں جو طلوعِ اسلام کی وساطت سے چاروں طرف اپنی کرنیں پھیلائے چلی آرہی ہے۔

معرکۂ دین و وطن

۱۹۳۸ء میں مسلم لیگ کے پرچم تلے قومی جد و جہد کا نیا محاذ تحریکِ پاکستان کا رُخ کر رہا تھا اور حالات بتا رہے تھے کہ اس تحریک کے مقابلے میں وہ مذہبی پیشوائیت ہراول دستہ بن کر آئے گی جو وار دھا آشرم اور آنند بھون کو اپنا کعبۂ مقصود بنائے ہوئے ہے۔ اس سے چند ہی ماہ قبل اِس کے سرخیل مولانا حسین احمد مدنی (مرحوم) نے وطنی قومیت کا نعرہ بلند کر کے علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کو خون کے آنسو رونے پر مجبور کر دیا تھا۔ اور پھر وہ معرکۂ دین و وطن سامنے آیا تھا جس میں بسترِ مرگ پر پڑے ہوئے حکیم الامت اقبالؒ نے مولانا حسین احمد مدنی مرحوم کے اس نظریہ کی دھجیاں بکھیر کر رکھ دی تھیں اور اب یہ خطرہ واضح تھا کہ یہ نیشنلسٹ علماء کے ناقوس خصوصی (روزنامہ "الجمعیتہ" مدینہ بجنور۔ "زمزم" اور دیگر اخبارات) مذہب کی آڑ میں مسلمانوں کی نشاۃِ ثانیہ کی تحریک پر کیچڑ اچھالنے میں کوشاں ہوں گے۔ ملت کے اجتماعی عزم کے خلاف مذہبی پیشوائیت کی اس یلغار کو روکنے کے لئے "طلوعِ اسلام" کا اجرا ہوا۔ اور تحریکِ پاکستان کو تقاضائے دین قرار دیتے ہوئے فکرِ قرآنی کے اس نقیب نے جس طرح ہر محاذ پر نیشنلسٹ مسلمانوں کے ترجمان اخبارات کی کانگرس نوازی کے تار و پود بکھیرے اسے تحریکِ پاکستان کے ایک مستقل باب کی حیثیت حاصل ہے۔ علامہ اقبالؒ کے سانحۂ رحلت کے بعد جب مولانا حسین احمد مدنی مرحوم نے از سرِ نو معرکۂ دین و وطن کا آغاز

---

(۱) یہ خطاب ۱۹۶۵ء میں پیش کیا گیا تھا۔ (طلوعِ اسلام)

کرنے کی جرأت کی تو یہ طلوعِ اسلام ہی تھا جس نے اقبالؒ کی جانشینی کا حق ادا کرتے ہوئے ان تنکوں کے پلوں کو بہا کر رکھ دیا جنہیں مولانا مدنی مرحوم نے اپنے بیان کے ذریعہ تعمیر کرنے کی سعی ناکام کی تھی۔ تحریکِ پاکستان کے خلاف اِن "مقدسینِ کانگریس" کی یہ یلغار اس قدر شدید تھی کہ اس کے جواب میں طلوعِ اسلام بصیرتِ قرآنی کا اس قدر مؤثر مظاہرہ نہ کرتا تو عین ممکن تھا کہ اِن حضرات کی مقدس نقابوں میں لپٹی ہوئی مذہبی تاویلات دس کروڑ مسلمانوں کی اجتماعی جدّوجہد کو خاسر و ناکام بنا کر رکھ دیتیں اور مسلمان جبہ و دستار کی مجہول بھلیوں میں کھو کر رہ جاتے۔

تحریکِ پاکستان اور طلوعِ اسلام

لیکن طلوعِ اسلام نے اس مقدس نقاب کا ایک ایک تار بکھیر کر رکھ دیا اور پوری ملت کو ذہن نشین کرا دیا کہ اسلام کے نام پر جو کھیل کھیلا جا رہا ہے، یہ اسلام کی ترجمانی ہرگز نہیں بلکہ واردھا آشرم کے مہاتماؤں اور آنند بھون کے پنڈتوں کی اشیرباد حاصل کرنے کی ایک ایسی گھناؤنی سازش ہے جس کا مقصد ملّتِ اسلامیہ کو اس کی منزلِ مراد سے محروم کرنے کے سوا کچھ نہیں۔ طلوعِ اسلام کی اس ضربِ کلیمی نے وطنی قومیت کے بت اس جرأت سے پاش پاش کیئے کہ اس کے گہرے زخم آج تک اس کی آتشِ انتقام کو بھڑکا رہے ہوئے ہیں اور افتراپردازیوں اور بہتان طرازیوں کا کوئی فتنہ نہیں جو عوام کو مبتلائے فریب کرنے کے لئے اس کے خلاف بروئے کار نہ لایا گیا ہو۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ تمام حربے جو سرسیدؒ کے خلاف استعمال کیئے گئے تھے۔ اب پرویز صاحب کے خلاف استعمال میں لائے جا رہے ہیں۔ تاریخ اپنے آپ کو دہرا رہی ہے۔ لیکن اس کا انجام کیا ہو گا۔ وہ بھی ظاہر ہے۔ اگر کل سرسیدؒ کے تحمّل اور بردباری نے ان اشتعال انگیزیوں کو خاسر و ناکام بنا کر رکھ دیا تو آج بھی انہیں اسی نامرادی سے دوچار ہونا پڑے گا۔ قرآن کی عالم آرا دعوتِ انقلاب کے مقابل خودساختہ مذہب کے لات و ہبل بالآخر زمین بوس ہو کر رہیں گے۔ یہ خدا کی وہ سُنّت ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی۔ اور یہ تاریخ کا وہ اٹل فیصلہ ہے جو ہر دَور میں دہرایا گیا ہے۔

پاکستان اور قرآنی نظام

آج مملکتِ پاکستان کو ایک نظام کی ضرورت ہے۔ ایک ایسے مستحکم، پائیدار اور عالم آرا نظام کی جس کی بدولت جنتِ ارضی کی بساط بچھ جائے۔ یہ نظام صرف قرآن کی بارگاہ سے مِل سکتا ہے۔ اس قرآنی نظام میں نہ مذہبی فرقہ بندی باقی رہ سکتی ہے اور نہ سیاسی پارٹیوں کا وجود۔ خدا کے دین میں صدیوں سے بپا کردہ یہ سارا انتشار شرک کے مترادف ہے۔ اور قرآنی نظام کے سوا اسے کوئی دوسری تدبیر حل نہیں کر سکتی۔ اس نظام میں "سلطانی و ملّائی و پیری" کے جذام اور سرسام سے نوعِ انسانی کو کلیتہً نجات مل جاتی ہے۔ خاص قوانینِ خداوندی کی اطاعت سے ہر نوع غلامی کی زنجیریں ٹوٹ کر رہ جاتی ہیں اور ہر انسان سر اٹھا کر چلنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ اِس نظام میں دولت و پیداوار کے سرچشموں پر کسی فرد یا گروہ کی اجارہ داری باقی نہیں رہتی۔ کوئی فرد دوسروں کی خون پسینے کی کمائی پر عیش نہیں لوٹ سکتا۔ اور ہر انسان کا حق: لَیْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰی کے اصول پر طے پا جاتا ہے۔

(۰)

تحریکِ طلوعِ اسلام کا مقصود

طلوعِ اسلام کی تحریک، پاکستان میں اسی قرآنی نظام کے قیام و دوام کے لئے کوشاں ہے۔ اسی مثالی نظام کی تکمیل کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا۔ لیکن اس نظام کو جبراً نہیں ٹھونسا جا سکتا۔ بلکہ افرادِ مملکت کو علیٰ وجہ البصیرت اس کی برکات و حسنات کو سمجھنے کے قابل بنایا جائے گا۔ اور یہ قرآنی تعلیمات کو عملاً رائج کئے بغیر ممکن نہیں۔ یہاں وہی راہ اختیار کرنی ہوگی جو سر سیدؒ نے مدرسہ علی گڑھ کا آغاز کرتے ہوئے اختیار کی تھی۔ علی گڑھ کی قومی تعلیمات کا منشا و مقصود ہماری نئی نسلوں کو ان علوم سے بہرہ ور کرنا تھا جو انہیں شعوری طور پر حالات کے تقاضوں اور وقت کے چیلنج کا سامنا کرنے کے قابل بنا سکیں۔ اور آج جبکہ حصولِ پاکستان کے بعد ان تقاضوں نے ایک نیا رُخ اختیار کر لیا ہے اور مملکت میں ایک نئے نظام کی تشکیل کا کٹھن مرحلہ کئی برسوں سے سب کے سامنے ہے اسے حسن و خوبی سے طے کرنے کے لئے قرآن کی تعلیمات نئی نسلوں کے سامنے لانی پڑیں گی۔ وقت اور حالات کی یہ وہ ناگزیر ضرورت ہے جسے پورا کئے بغیر تحریکِ پاکستان کے منشاء و مقصود کی تکمیل ممکن نہیں۔

یہاں ایک لمحہ کے لئے رُک کر ہمیں وہ حقیقت اپنے ذہنوں میں پھر تازہ کر لینی چاہیئے جس کی خاطر پاکستان کی جنگ لڑی گئی۔ اور اپنی جداگانہ مملکت کے قیام کے لئے یہ خطۂ زمین حاصل کیا گیا۔ اس خطۂ زمین میں کس قسم کا نظامِ مملکت قائم کرنا مقصود تھا اسے خود بانیٔ پاکستان کے الفاظ میں سامنے لایئے۔ مارچ سنہ ۱۹۴۰ء سے تحریکِ پاکستان کا آغاز ہو چکا تھا۔ اور اس سے اگلے ہی سال ۹ / اگست سنہ ۱۹۴۱ء کو قائداعظمؒ عثمانیہ یونیورسٹی حیدر آباد میں تشریف لے گئے اور وہاں ایک سوال کے جواب میں انہوں نے دو ٹوک اور متعین الفاظ میں یہ ارشاد فرمایا تھا کہ

> اسلامی حکومت کے تصوّر کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیئے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآنِ مجید کے احکام و اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ پارلیمان کی۔ نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کریم کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اور حکمرانی کے لئے آپ کو لامحالہ ایک مملکت کی ضرورت ہے۔

یہ تھی بانیٔ پاکستان کی زبان سے اس مقصدِ عظیم کی وضاحت جس کے لئے مسلمانوں کی ایک جداگانہ مملکت کے حصول کی جدّوجہد شروع ہوئی تھی۔ صاف اور واضح ہے کہ بانیٔ پاکستان کے نزدیک پاکستان میں قرآنی اصول و احکام کے سوا کسی کی حکمرانی قائم نہیں ہو سکتی۔ اس مسئلہ کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے علامہ اقبالؒ نے فرمایا تھا کہ

> میرا عقیدہ ہے کہ جو شخص اس وقت قرآنی نقطۂ نگاہ سے زمانہ حال کے جورس پروڈنس پر ایک تنقیدی نگاہ ڈال کر احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کر دے گا۔ وہی اسلام میں مجدد ہوگا اور

بنی نوعِ انسان کا سب سے بڑا محسن بھی ہو گا .... افسوس کہ زمانہ حال کے اسلامی فقہا یا تو زمانہ کے میلانِ طبیعت سے بالکل بے خبر ہیں یا قدامت پرستی میں مبتلا۔ میری ناقص رائے میں اسلام اس وقت گویا زمانے کی کسوٹی پر کسا جا رہا ہے۔ اور شاید اسلام کی تاریخ میں ایسا وقت اس سے پہلے کبھی نہیں آیا۔ (اقبال نامہ۔ جلد اوّل صفحہ)

اقبالؒ و جناحؒ کے الفاظ میں یہ تھے وہ عظیم ترین تقاضے جن کی بجا آوری اس مملکت میں پہلے دن سے مقصود تھی یعنی :-

۱- اس مملکت میں خالص قرآنی اصول اور احکام کی کارفرمائی - اور

۲- احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو علیٰ وجہ البصیرت ثابت کرنا اور انہیں عملاً متشکل کرنے کی جدوجہد کرنا۔

اس منتہیٰ و مقصود کو پیش نظر رکھیے۔ گزشتہ سترہ اٹھارہ برس کی تاریخ کا جائزہ لیجئے اور پھر ایمانداری سے اس تلخ حقیقت پر غور فرمائیے کہ اس عظیم مقصود و منتہیٰ کی خاطر جس کی راہ میں ہم نے ایک دنیا سے لڑائی مول کی اور قدم قدم پر گہرے زخم کھائے، ہم نے کیا کچھ کیا؟ حکومت ہو یا عوام، ارباب سیاست ہوں یا مذہبی پیشوا۔ کیا کسی گوشے میں بھی ایسی سعی و کاوش کا کوئی ثبوت ملے گا جو احکامِ قرآنیہ کی ابدیت کو ثابت کرنے اور پاکستان میں ان کی کارفرمائی کا امکان پیدا کرنے کے لئے بروئے کار لائی گئی ہو؟ اسکولوں کے لئے دینیات کے نصاب مرتب ہوئے۔ مذہبی درس گاہوں کا سلسلہ بڑھانے کے لئے لاکھوں روپوں کی چندہ بازی ہوتی رہی۔ لیکن کیا کوئی بتائے گا کہ ان اسکولوں، کالجوں اور درس گاہوں میں اس تقاضائے دین و ایمان کو پورا کرنے کے لئے کوئی ایک قدم بھی مؤثر طور پر اٹھا؟ نہیں بلکہ لاکھوں کے اس صرفِ عظیم سے دینیات کے نام پر جو کچھ ہمارے طالب علموں کو پڑھایا جاتا ہے اس کا کوئی ادنیٰ سا تعلق بھی ان تعلیماتِ قرآنی سے ہے جو قرآنی احکام کی ابدیت کو واضح کر سکیں اور انہیں مملکت میں عملاً متشکل کرنے کا ذرا سا امکان روشن ہو؟

صرف ایک آواز

ان اٹھارہ سالوں میں صرف ایک ہی آواز تھی جو مراجعت الی القرآن کا نعرہ بلند کرتی رہی۔ قرآن کے ابدی حقائق کو ابھار اور نکھار کر منظرِ عام پر لاتی رہی۔ یہ مفکرِ قرآن محترم پرویز صاحب کی شخصیت تھی جس نے اس مقصدِ عظیم کے لئے اپنے آپ کو وقف کر دیا اور اس راہ میں دن رات ایک کر دیا جس کے قلبِ مضطرب کی بیتابیاں اور دیدۂ تر کی بے خوابیاں، جس کی امنگیں اور آرزوئیں، دعائیں اور امیدیں برابر اس مقصدِ عزیز پر مرکوز رہیں۔ جس کی فکر و بصیرت نے کتابِ خداوندی پر پڑے ہوئے سازشِ عجم کے ایک ایک نقاب کو الٹا جس نے عصرِ حاضر کے تقاضوں کا حل قرآن کی زبان سے دنیا کے سامنے پیش کیا۔ جس نے خون کے گھونٹ پی پی کر اپنوں اور بیگانوں کی بدترین افترا پردازیاں گوارا کیں۔ لیکن اقبالؒ و جناحؒ کی روح کی پکار پر شب و روز اس جنون میں سرگرم کار رہا کہ پاکستان میں قرآنی نظام کی صبح بہار جلد طلوع ہو اور اس کی جلوہ باریوں میں جنت سے نکلا ہوا آدم پھر سے اپنے فردوسِ گم گشتہ

ط۔ ص۲ یہ ۱۹۲۵ء میں کہا گیا تھا۔

کو پالے۔

یہ ایک فرد جو اپنی ذات میں پوری ملت کو سموئے ہوئے ہے قرآن کی انقلابی آواز برابر بلند کئے چلا آرہا ہے۔ اس کی آواز اب ایک فردِ واحد کی آواز نہیں رہی بلکہ ملت کے سینکڑوں سلیم بیٹے اور طاہرہ بیٹیاں اس آواز کو تقاضائے ایمان سمجھ کر اس پر لبیک کہہ رہی ہیں۔ اس شمع قرآنی کے گرد پروانوں کا ہجوم ہے اور یہ مردِ درویش اسے مخالفت کی تندوتیز آندھیوں میں بحفاظت تمام برابر چلائے چلا جا رہا ہے۔ اس کی ننھی سی لو اب بیرونِ پاکستان بھی سینکڑوں پروانوں کو تعاون کی دعوت دے رہی ہے اور یہ پروانے اس روشنی کی طرف کھنچے چلے آرہے ہیں جو چودہ سو برس قبل حضور رسالت مآبؐ، وَالَّذِیْنَ مَعَہٗ کے مبارک ہاتھوں سے روشن ہوئی اور عرب و عجم کی سیہ بختیوں کو زندگی کی بھرپور سعادتوں سے مالا مال کر گئی۔

سرسیدؒ نے قوم کی بگڑی بنانے کے لئے یہ ناگزیر سمجھا تھا کہ افرادِ ملت کے قلوب و اذہان کی تربیت کا خصوصی اہتمام ہو اور حالات کے تقاضوں کے مطابق قوم کی نئی نسلوں کے لئے ایسی درس گاہ کا قیام عمل میں لایا جائے جو انہیں اپنے مقام سے آگاہ کر سکے اور گذرگہِ حیات پر اپنی حقیقی منزل تک پہنچنے کا شعور عطا کر دے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کا مقصد مولانا صلاح الدین احمد مرحوم کے الفاظ میں یہ تھا کہ

> وہ (سرسیدؒ) علی گڑھ کو مسلم لیڈرشپ کے لئے ایک زندہ و پائندہ درس گاہ بنانا چاہتے تھے۔ سرسیدؒ کی دُور بینی نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ جو کام وہ اپنی زندگی میں شروع کر جائیں گے۔ اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور محیطِ کل ہو جانے کی ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ پروگراموں کی بجائے وہ پروگرام دینے والے پیدا کریں جو حالات کے مطابق اس عظیم خاکے میں رنگ بھرتے چلے جائیں جو انہوں نے ملتِ اسلامیہ ہند کی فلاحِ عام کے لئے تیار کیا تھا...... چنانچہ علی گڑھ کو انہوں نے اس نمونے پر تیار کیا تھا کہ وہ مسلمانانِ ہند کی وحدتِ خیال کا مرکز بن گیا۔ اور بیداری و رہبری کی جو لہریں یہاں سے منتشر ہوئیں وہ برِعظیم ہند کے ہر گوشے میں پہنچ کر اثر آفریں ثابت ہوئیں۔
> (مقالہ —— سرسیدؒ احمد خاں پر ایک نظر)

دانش گاہِ قرآنی کی تاسیس

حالات کے نئے تقاضوں نے اب پھر اسی مقصد کے تحت ہمارے دروازوں پر دستک دی ہے اور وہ وقت آگیا ہے کہ قرآن کی دعوتِ انقلاب اپنے مرکزِ تربیت کا قیام عمل میں لائے۔ پرویز صاحب کی بصیرتِ قرآنی کا سلسلہ اب اس مقام تک پہنچ گیا ہے جہاں ان کی دعوتِ انقلاب ہزاروں سلیم بیٹوں اور طاہرہ بیٹیوں کا سرمایۂ دین قرار پا جائے اور جو کام انہوں نے سالہا سال قبل تن تنہا شروع کیا تھا، اس کے جاری رہنے، فروغ پانے اور ملتِ پاکستان کے وحدتِ خیال کا مرکز بن جانے کا امکان روشن ہو۔ قرآنی فکر و بصیرت کا یہ بیش بہا سرمایہ نئی نسلوں کو تعلیم و تربیت کا سامان بن جائے اور اس روشنی کے عام پھیل جانے سے اس انقلابِ عظیم کے تقاضے حسنِ انجام کو پہنچیں جو تحریکِ پاکستان کا آئینہ دار تھا اور ملتِ اسلامیہ کے مستقبل

کی روشن تقدیر۔

دانش گاہِ قرآنی (طلوعِ اسلام کالج) کے قیام کا فیصلہ انہی مقدس آرزوؤں کا پیکرِ جمیل بن کر ملتِ پاکستان کے سامنے آرہا ہے۔ علی گڑھ یونیورسٹی کے قیام کے کم و بیش ایک صدی بعد یہ اپنی نوعیت کی پہلی درس گاہِ ملّی ہوگی جو حالات کے تقاضوں کی بجاآوری کا سامان مہیا کرے گی۔ قرآن کی آواز، قرآن کا پیغام، قرآن کے حقائق، قرآن کے اصول و اقدار اور قرآن کے قوانین و احکام۔ اور یہ سب کچھ قرآن کی اپنی تعلیمات کی روشنی میں۔ سوچیئے کہ اس درس گاہ سے کس قدر صالح انقلاب ہماری قومی زندگی میں اُبھر رہے گا۔ سرسیّد کی طرح شاید پرویز صاحب بھی اپنی خونِ جگر سے سینچی ہوئی اِس کشتِ نوبہار کے برگ و بار دیکھنے تک کا انتظار نہ کر سکے لیکن قرآنی تعلیمات کا یہ تخمِ صالح جو نئی نسلوں کے قلب و نگاہ میں قرار پکڑے گا وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ یقیناً برگ و بار لائے گا۔ اس کی ننھی ننھی کونپلیں ایسے لہلہاتے ہوئے شجرِ طیّب میں تبدیل ہو جائیں گی، جس کی ثمر باریوں سے عالمِ انسانیت کا گوشہ گوشہ فیضیاب ہوگا۔ اس لئے ہوگا کہ یہ کسی فرد یا گروہ کی ذاتی فکر و کاوش کا معجزہ نہیں ہوگا۔ بلکہ یہ اس کتابِ عظیم کا فیضِ عام ہوگا جو صدیوں قبل حیاتِ انسانی میں جنتِ ارضی کا نقشہ قائم کر گئی اور اب صدیوں سے ریشمی غلافوں میں لپٹی پڑی ہے۔ اِسے کھولا جاتا ہے تو اس لئے نہیں کہ اس کے بابِ عالی سے اپنے پُر پیچ مسائل کا حل تلاش کیا جائے بلکہ محض "حصولِ ثواب" کی خاطر۔

دانش گاہِ قرآنی اس کتابِ عظیم کو ان غلافوں سے نکال کر منظرِ عام پر لائے گی۔ اس کے ابدی حقائق پر سے صدیوں کے نقاب الٹ دیئے جائیں گے اور اس کی ایک ایک آیت زبانِ حال سے پکار پکار کر بتائے گی کہ نوعِ انسانی کی منزلِ مقصود کیا ہے اور اس کتاب کے صدقے میں اقوامِ عالم کی امامت کا فریضہ کس حسن کارانہ انداز سے سرانجام پاتا ہے۔ ہاں یقیناً!

آئے گی فیض اِک دن، یادِ بہار لے کر!
تسنیم سے فروزاں پیغامِ مےگساراں

یہ امر کس قدر موجبِ مسرت و تہنیت ہے کہ آج جب ہم مدرسۂ علی گڑھ کے یومِ تاسیس کے نوّے سال کے بعد، اس کی یاد تازہ کر رہے ہیں۔ پرویز صاحب کی زیرِ نظر دانش گاہِ قرآنی کا منشور اس کی تفاصیل کے لئے وجہ تابانیِ قلب و نگاہ بن رہا ہے۔ درحقیقت ہم اس پیامِ بہار کیلئے ایک مدت سے ہمہ تن انتظار تھے۔

کراچی کے خریدار متوجّہ ہوں!

کتب خانہ کے اوقاتِ کار حسبِ ذیل ہیں

ہر روز علاوہ جمعہ:۔ شام ۶ بجے تا ۸ بجے شب

جمعہ:۔ صبح ۹ بجے تا ۱۲ بجے دوپہر

نیز کتب خانہ میں ادارہ طلوعِ اسلام کی مطبوعات بھی دستیاب ہیں اور ایک کارڈ تحریر کر کے منگوائی بھی جا سکتی ہیں۔

محمد اسلام۔ کتب خانہ بزمِ طلوعِ اسلام

کمرہ نمبر ۲۴۔ ہارون چیمبرز۔ کراچی ۲

فہرست معطیان قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی

(۱۱ دسمبر ۱۹۷۹ء تک موصول ہونے والے عطیات)

اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر	اسمائے گرامی	رقم	رسید نمبر
۱۔ محترم چوہدری علی شیر چشتی صاحب (بہاولپور)	۱۰۰/- روپے	۲۱۵۱/۵۷	۲۱۔ محترم محمد ارشاد صاحب (چادرہان)	۵۰/- روپے	۲۱۷۱
۲۔ محترم نواب شاہ صاحب (کنعدیاں)	۱۰۰/- ″	۲۱۵۲	۲۲۔ محترم محمد اکبر خانصاحب (جہلم شہر)	۵۰/- ″	۲۱۷۲
۳۔ محترم طارق خانصاحب (ایبٹ آباد)	۸۱/- ″	۲۱۵۳	۲۳۔ محترم عبداللطیف و محمود علی صاحبان		
۴۔ معطی اپنا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتے۔	۱۰۰۰/- ″	۲۱۵۴	(مردان)	۵۰۰/- ″	۲۱۷۳
۵۔ محترم محمود حسین صاحب (کراچی)	۲۰۰/- ″	۲۱۵۵	۲۴۔ محترم فضل کریم طارق صاحب (چکوال)	۱۰۰/- ″	۲۱۷۴
۶۔ محترم محمد ارشاد صاحب (چادرہان)	۵۰/- ″	۲۱۵۶	۲۵۔ محترمہ بیگم ظفر سعید صاحبہ (راولپنڈی)	۱۰۰/- ″	۲۱۷۵
۷۔ محترم صفدر حسین صاحب (کراچی)	۱۰۰۰۰/- ″	۲۱۵۷	۲۶۔ محترمہ بیگم حمیدہ شجاع صاحبہ (″)	۱۰۰/- ″	۲۱۷۶
۸۔ محترم چوہدری محمد نواز صاحب (راولپنڈی)	۵۰۰/- ″	۲۱۵۸	۲۷۔ محترم چوہدری علی شیر چشتی صاحب (بہاولپور)	۱۰۰/- ″	۲۱۷۷
۹۔ محترم عبیداللہ جان میاں صاحب (ملکہ ڈھیر)	۱۰۰/- ″	۲۱۵۹	۲۸۔ محترم ڈاکٹر منصور عالم صاحب (سعودی عرب)	۱۰۰۰/- ″	۲۱۷۸
۱۰۔ محترم محمد اسلم صاحب (گوجرہ)	۵۰۰/- ″	۲۱۶۰	۲۹۔ محترم محمد امین خانصاحب (حیدرآباد)	۲۳/- ″	۲۱۷۹
۱۱۔ محترمہ بیگم ظفر سعید صاحبہ (راولپنڈی)	۵۰۰/- ″	۲۱۶۱	۳۰۔ محترمہ عارفہ بٹ صاحبہ (لاہور)	۵۰۰/- ″	۲۱۸۰
۱۲۔ محترم محمد صدیق خانصاحب (ملتان)	۵۰۰/- ″	۲۱۶۲	۳۱۔ محترم میر محمد شفیع صاحب (″)	۱۰۰/- ″	۲۱۸۱
۱۳۔ محترم محمد دین صاحب (چک ۲۳)	۱۰۰/- ″	۲۱۶۳	۳۲۔ محترم محمد صدیق خانصاحب (ملتان)	۱۰۰/- ″	۲۱۸۲
۱۴۔ محترم محمد اکرم صاحب (اچھان غفور)	۱۰۰/- ″	۲۱۶۴	۳۳۔ محترم عبدالحئی صاحب (بولیسے ۱۱۲)	۵۰۰/- ″	۲۱۸۳
۱۵۔ محترم احسان اللہ صاحب (ایبٹ آباد)	۱۰۰/- ″	۲۱۶۵	۳۴۔ محترم ڈاکٹر ایس ایچ بادر صاحب		
۱۶۔ محترم ایم وائی بٹ صاحب (مدینہ منورہ)	۵۰۰۰/- ″	۲۱۶۶	منجانب فیملی محترمہ حمیدہ خاتون مرحومہ (راولپنڈی)	۱۰۰۰/- ″	۲۱۸۴
۱۷۔ محترمہ بیگم بلند اختر صاحبہ (کراچی)	۱۰۰۰/- ″	۲۱۶۷	۳۵۔ محترم ابراہیم خانصاحب (دوحا قطر)	۵۰۰/- ″	۲۱۸۵
۱۸۔ محترمہ بیگم عابدہ خانصاحبہ (منامہ)	۱۴۳/- ″	۲۱۶۸	۳۶۔ محترم اسماعیل عابد صاحب (PRETORIA)	۱۰۰۰/- ″	۲۱۸۶
۱۹۔ محترم عارف حسین صاحب (ابوظہبی)	۱۰۰۰/- ″	۲۱۶۹	۳۷۔ محترم لیاقت علی صاحب (الخبر)	۱۰۰/- ″	۲۱۸۷
۲۰۔ محترم جسٹس (ریٹائرڈ) محمد گل صاحب	۱۰۰۰/- ″	۲۱۷۰	۳۸۔ محترم سلطان احمد صاحب (چشتیاں)	۱۵۰۰/- ″	۲۱۸۸
(اسلام آباد)			۳۹۔ محترمہ مسز رابعہ شوار صاحبہ (اسلام آباد)	۲۰۰/- ″	۲۱۸۹

۱۔ معطیان کو سوسائٹی کی جانب سے مطبوعہ رسیدیں بھیجی جا چکی ہیں۔ رسیدوں کا نمبر فہرست میں دیا گیا ہے۔

۲۔ فہرست بڑی احتیاط سے مرتب کی گئی ہے۔ بایں ہمہ معطی حضرات اسے چیک کر لیں اور اگر کہیں کوئی غلطی نظر آئے تو ہمیں مطلع فرمائیں۔

ضروری وضاحت:۔ عطیات چیک یا ڈرافٹ قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی کے نام سے حبیب بینک۔ مین مارکیٹ۔ گلبرگ ۲۔ لاہور۔ (اکاؤنٹ نمبر 6239 - S.C) پر کاٹے جائیں۔

مرزا محمد خلیل غازی
قرآنک ایجوکیشن سوسائٹی
۲۵/ بی گلبرگ ۳۔
(لاہور)

محترم پرویز صاحب کا

درسِ قرآن

بزمِ طلوعِ اسلام ہر ماہ کے پہلے اتوار کو ڈھائی بجے دوپہر (بذریعہ ٹیپ)

لندن (انگلینڈ)

149 SUTTON COURT RD
LONDON E-13 — 9NR.
PHONE 01 — 552 — 1517

لاہور میں ہر جمعہ ½ ۹ بجے صبح (فون ۸۸۰۸۰۰)
بی ۲۵/۲ گلبرگ ۲ نزد پولیس اسٹیشن

فیصل آباد میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) دفتر
چوہدری شاہنواز صاحب۔ عابد سلک انڈسٹریز
عقب اڈہ لاریاں (مائی دی جھگی) (فون ۳۰۸۹۰)

کراچی میں ہر جمعہ کو ½ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) کتب خانہ
بزم طلوع اسلام۔ کمرہ نمبر ۲۳ ہارون چیمبرز
الطاف حسین روڈ۔ نیو چالی۔ کراچی ۲

گوجرانوالہ میں ہر جمعہ ۴ بجے شام (بذریعہ ٹیپ) رہائش گاہ
چوہدری مقبول شوکت۔ گل روڈ سول لائنز
(بالمقابل پرانا ریلوے اسٹیشن)

پشاور میں ہر جمعہ ۹ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ) بر مکان۔ آغا
محمد یونس صاحب۔ رفیقی لین صدر۔ بالمقابل وی آئی پی
مین گیٹ۔ پشاور سٹیڈیم۔ بارہ روڈ (فون ۷۲۶۵۹)

گجرات میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ نیز بروز اتوار ۴ بجے شام
بمقام ۱۲/۱/بی جمبر روڈ (بذریعہ ٹیپ)

مردان میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
بر مکان ڈاکٹر رضا محمد خان۔ نواب علی روڈ

جلالپور جٹاں میں ہر جمعہ بعد نماز جمعہ (بذریعہ ٹیپ)
دفتر بزم طلوع اسلام (بازار کلاں)

راولپنڈی میں ہر جمعہ ۵ بجے شام (بذریعہ ٹیپ)
جی ۱۲۶ ۔ لیاقت روڈ

ملتان میں ہر جمعہ ۱۰ بجے صبح (بذریعہ ٹیپ)
دفتر شاہ سنز بیرون پاک گیٹ۔ (فون ۳۱۰۰۷)

لیہ (بذریعہ ٹیپ) ہر جمعہ بعد نماز مغرب
رہائش گاہ ڈاکٹر اظہر ملک صاحب سرکلر روڈ۔ لیہ

پنج کسی میں ہر جمعہ (بذریعہ ٹیپ) بوقت ۳ بجے شام
(تحصیل کبیر والا ضلع ملتان) بمقام مطب حکیم احمد الدین صاحب
نمائندہ بزم طلوع اسلام

خالص ہلدی مرچ مصالحے
حاصل کرنے کے لئے
اللہ والے
ریلوے روڈ گجرات
سے رجوع فرمائیے